وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ

اور آپ صلعم ہر قوم کے لئے ہادی ہیں

ہادیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل سیرتِ پاک جو عصری تقاضوں کے مطابق بالکل نئے انداز میں مرتب کی گئی ہے

تالیف

مفسرِ قرآن حضرت مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی دہلوی

ناشر

"مکتبہ رحمتِ عالم کانفرنس" لال کنواں دہلی

(مطبوعہ کوہ نور پریس دہلی)

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون سیرتِ پاک	صفحہ

نمبر شمار	مضمون سیرت پاک	صفحہ

صفحہ	مضمون سیرتِ پاک	نمبر شمار

پیش لفظ

ہادیٔ اعظم حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش نظر سیرتِ پاک معاشرتی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے مرتب کی گئی ہے۔

اِس لئے آپ دیکھیں گے کہ سیرت کی مروجہ کتابوں کی طرح اِس میں حضور کی حیاتِ پاک کے مختلف واقعات کو سن وار بیان نہیں کیا گیا بلکہ اعتقادی اور عملی زندگی کے ۴۳ اہم عنوانات کے تحت آپ کی ۶۳ سالہ حیاتِ پاک کے انفرادی، اجتماعی، اخلاقی، سیاسی، سماجی اور انقلابی پہلوؤں کو عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق فکر انگیز اسلوب اور سبق آموز اندازِ بیان کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ حضور کی زندگی کا ہر واقعہ صرف ایک واقعہ کے طور پر پڑھنے والے کے سامنے نہ آئے بلکہ ہدایت اور سعادت کا ایک زندہ پیغام بن کر اُس کے دل و دماغ میں اتر جائے اور اس کی روح میں سما جائے۔

قرآن کریم کا یہ دعوے برحق ہے کہ ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک نوعِ انسانی کے لئے ہر دور میں کامیاب رہنما ثابت ہوگی۔

پیش نظر کتاب اِسی دعوے کی ایک واضح دلیل ہے اور محض کتاب کے

عنوانات پر ایک نظر ڈالنے والا اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ حضور کی حیات پاک میں ہر طبقہ اور ہر دور کے ——— انسان کے لئے مکمل ہدایت موجود ہے۔

کوشش کی گئی ہے کہ "واقعات" تاریخ و حدیث کی مستند کتابوں سے اخذ کئے جائیں اور کتاب کی زبان اتنی سادہ اور شگفتہ ہو کہ ہر ذوق اور ہر طبقہ کا انسان ——— مرد و عورت، بچے اور بچیاں، اور جوان اور بوڑھے اس اہم کتاب سے یکساں سبق حاصل کریں۔ اور یہ کتاب ہر مسلمان مرد و عورت کے لئے ایک مکمل دستورِ حیات ثابت ہو، محض "تاریخ و سیر کی کتاب" بن کر نہ رہ جائے۔

یقینِ کامل ہے کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو رفعت بخشی ہے اسی طرح سیرت محبوب کی اس کتاب "ہادیٔ اعظم" کو بھی قبولِ عام عطا فرمائے گا۔

اخلاق حسین قاسمی دھلوی
۲۹ رمئی ۱۹۶۶ء، ۸ صفر ۱۳۸۶ھ
بیت الہدایت ۱۸۸۳ لال کنواں
دہلی ۶

تعارُف

حضرت مولینا سید محمد میاں صاحب دامت برکاتہم شیخ الحدیث و صدر مفتی

مدرسہ امینیہ دہلی

دہلی کے مشہور عالم اور خطیب حضرت مولینا **اخلاق حسین صاحب قاسمی** مستحق شکریہ ہیں کہ جس طرح دہلی اور قرب و جوار کے مسلمان اُن کے مواعظ حسنہ، درسِ قرآنِ حکیم اور نہایت مفید، بصیرت افروز، اصلاحی اور تبلیغی تقریروں سے مستفیض ہوتے رہتے ہیں اُنہوں نے دَورِ حاضر اور مستقبل کے بے شمار مسلمانوں کو موقع دیا کہ اس عجیب و غریب، دل دوز و دل چسپ، نہایت مفید اور بہت قیمتی تصنیف کے ذریعہ ان کے فیوض سے مستفیض ہو سکیں جس میں فخر موجودات، سرور کائنات رحمۃ للعالمین، خاتم الانبیاء، افضل المرسلین (صلوٰت اللہ علیہ و تسلیماً ابداً دائماً کلما ذکرہ الذاکرون و کلما غفل عن ذکرہ الغافلون) کی سیرتِ مبارکہ کے خاص خاص اور نہایت اہم گوشوں کو بالکل نرالے انداز سے واضح کیا ہے

بظاہر یہ کتاب تقریباً دو درجن علمی اور تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انہیں مقالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری سیرت بالکل اچھوتے انداز سے سمو دی گئی ہے

یہ مقالات عشق مولا کے سرمستوں اور محبتِ محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے متوالوں کے لیئے بادۂ الفت کے چھلکتے ہوئے جام ہیں تو ایک متلاشیِ حق اور طالبِ حقیقت کے لئے علمی تحقیقات کے بیش قیمت گلدستے، ایک خطیب اور مقرر کے لئے بیش بہا علمی اور تاریخی ذخیرے اور اُردو ادب بالخصوص دِلّی کی ٹکسالی زبان کے قدر دانوں کے لئے صدا بہار پھولوں کے گجرے ہیں۔

بہر حال یہ مختصر مگر جامع تصنیف ہر طبقے کے لئے قابل قدر اور ہر ایک ذوق کے لئے سامان تسکین ہے اور اس قابل ہے کہ ہر ایک پڑھا لکھا مسلمان اس سے نہ صرف بہرہ اندوز ہو بلکہ اِس کو حرزِ جان بنائے۔

کتاب کی بعض روایتیں ممکن ہے کہ اہل علم کے لئے خلش پیدا کریں کہ وہ سند کے لحاظ سے کمزور ہیں لیکن ازالۂ خلش کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اِس تصنیف کا تعلق فقہی اور اجتہادی مسائل سے نہیں ہے بلکہ اِس کا تعلق تاریخ اور سیرت سے ہے

تاریخ کے سلسلہ میں کسی دَور میں کسی بھی طبقہ نے روایت کرنے والوں کے لئے وہ تقدس اور وہ تقویٰ اور وہ حفظ و اتقان ضروری قرار نہیں دیا جو محدثین کرام اور علماءِ فقہ نے اِجتہادی مسائل میں راوی حضرات کے لئے ضروری قرار دیا ہے ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

مصنفِ محترم مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی کے اساتذۂ حدیث کا سلسلہ یہ ہے،

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہ العزیز
اُن کے استاد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز
اُن کے استاد حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز
اُن کے استاد امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ
اُن کے اُستاد حضرت شاہ عبد الغنی صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
اُن کے اُستاد حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
اُن کے استاد حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب استاد علماء ہند محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ الی آخرہ۔

فقہی اور اجتہادی مسائل میں علماء کرام اس روایت کو قابلِ استدلال سمجھتے ہیں جس کے راویوں یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک اساتذہ کا سلسلہ اسی درجہ کا ہو۔

ہر ایک استاذ نہ صرف اپنے زمانہ کا ممتاز عالم ہو بلکہ تقوے اور طہارت، خدا ترسی اور پاکبازی میں بھی اس کا درجہ ایسا ہی بلند ہو۔

لیکن آج جس فن (تاریخی تحقیقات) پر یورپ اور ایشیا کے مصنفین ناز کر رہے ہیں کیا اُن کے روایت کرنے والے مشاہدین اور مبصرین کے لئے بھی تقوے طہارت، راست بازی اور حق گوئی کو ضروری قرار دیا جاتا ہے
اِن گندم نما جو فروشوں کو تو تقویٰ و طہارت کی گرد بھی نصیب نہیں ہو سکتی

پس جس روایت کو محدثینِ کرام ضعیف یا کمزور قرار دیتے ہیں اُس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اِن کے بلند ترین شرائط اور زرّین اصول کے معیار پر پوری نہیں اُترتی ہے لیکن جہاں تک تاریخی روایات کے معیار کا تعلق ہے وہ بہرحال عام تاریخی روایات سے بہت بلند اور بہت زیادہ قابلِ اعتبار ہوتی ہیں۔ لہٰذا کسی ایسی تصنیف میں جس کا تعلق تاریخ و سیرت سے ہو اِن کا تذکرہ نہ کبھی قابلِ اعتراض سمجھا گیا ہے نہ آج قابلِ اعتراض ہونا چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب

محمد میاں عُفِرلہٗ

ناظم جمعیۃ علماء ہند۔ گلی قاسم جان۔
دہلی

فضائلِ انبیاء کا تعلق حُسنِ عمل سے

سیرت پاک کی پیش نظر کتاب چونکہ عملی نقطۂ نگاہ سے مرتب کی گئی ہے اس لئے سب سے پہلے اس بات کی وضاحت کی جارہی ہے کہ حضرات انبیا علیہم السلام کے فضائل اور مراتب کا تعلق اُن کے حسنِ عمل اور دینی جدّ وجہد کے ساتھ ہوتا ہے یعنی منصب نبوّت وہبی ہوتا ہے۔ لیکن فضائل و مراتب کا تعلق کسب وعمل سے وابستہ ہوتا ہے۔ مؤلف

اہلِ سنّت والجماعت میں کوئی گروہ ایسا نہیں جو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی فضائلِ شفاعت وغیرہ کا قائل نہو البتہ سمجھ دار علماء حضور کے فضائل کے بیان میں قرآن وحدیث کے محتاط طرز بیان کو ہر حال میں ملحوظ رکھتے ہیں۔

فضائل پر گفتگو کرتے وقت قرآن وحدیث کا طرز بیان کیا رہتا ہے ---؟
وہ حضرات جن کی قرآن وحدیث پر نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ کے پیغام نے روایتی خوش فہمیوں میں پھنسی ہوئی مذہبی دنیا کو عمل وسعی کی اہمیت سے آگاہ کیا، لوگوں کو بتایا کہ

"بقا اصلح" کی دوڑ میں عمل و قربانی کی راہ اختیار کیئے بغیر زندگی کی فلاح ممکن نہیں ہادیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رحمت، خدا کی رحمت اور اعمال حسنہ کی بشارت سناتے ہوئے بھی اِس نکتہ کو نظر انداز نہیں فرمایا اور ہر باب میں عملی جد وجہد کی ضرورت کو برقرار رکھا۔ اِسی لئے قرآن وحدیث کا بیان اِس سلسلہ میں بہت محتاط نظر آتا ہے۔

اگر اسلام اِس مسئلہ میں احتیاط اور اعتدال کا دامن چھوڑ دیتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس نے اِس آخری اُمّت کو بھی اگلی اُمتوں (یہود و نصاریٰ) کی طرح خوش فہمیوں کی بھُول بھلیوں میں بھٹکتے رہنے کے لئے چھوڑ دیا ہے

علماء کا وہ طبقہ جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی فضائل پر گفتگو کرتے وقت قرآن کے طرز بیان کی پابندیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے، ممکن ہے کہ وہ "غلو محبت" میں ایسا کرتا ہو۔ اور خدا کے ہاں وہ اِس آزاد روی میں معذور سمجھا جائے لیکن اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُمت کے عام افراد کے لئے اِن حضرات کا بیان و کلام نقصان دہ ثابت ہوتا ہے اور اِس لحاظ سے عین ممکن ہے کہ خدا کے نزدیک قابل مواخذہ بھی ہو۔

فضائل کے معاملہ میں شریعت کی احتیاط کیا ہے ——؟

ایک بنیادی احتیاط تو اِس مسئلہ میں یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے حضراتِ انبیاءٔ علیہم السّلام کے فضائل و کمالات کا تعلق ان حضرات کے عملی کارناموں سے قائم کیا ہے۔ یعنی قرآن کریم کا مطالعہ ہمیں اِس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ منصب نبوّت اگرچہ وہبی ہے، کسبی نہیں، مگر مراتب نبوت کا تعلق سعی و کسب سے ہے

مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کے درمیان فرقِ مراتب مسلّم ہے، یہ فرقِ مراتب قرآن کے بیان کے مطابق ان حضرات کی عملی جدوجہد اور ان کے تبلیغی کارناموں پر مبنی ہے اِس کے لئے میرے ذہن میں اِس وقت چند مثالیں مستحضر ہیں وہ پیش کرتا ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا ہے۔

واذ ابتلیٰ ابراھیمَ ربُّہٗ	اور جب آزمایا ابراہیم کو اس کے
بکلماتٍ فاتمھن قال	رب نے کئی باتوں میں پھر اُس نے وہ
انی جاعلکَ للناس	پوری کیں،
اماماً ؕ	تب فرمایا۔ میں تجھ کو کروں گا سب
(سورۂ بقرہ)	لوگوں میں پیشوا،

مطلب یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو جب خدا تعالیٰ مختلف طریقوں سے آزما چکا، حضرت ابراہیم نے حق کے لئے قوم کو چھوڑا، ماں باپ کو چھوڑا، حکومتِ وقت کے مقابلے پر سینہ سپر ہوئے، آگ میں ڈالے گئے، وطن سے ہجرت کی، بیوی بچے کو اپنی جان سے جُدا کر کے جنگل بیابان میں چھوڑ آئے، بیٹے کو خدا کی محبت میں ذبح کرنے کے لئے زمین پر پٹک دیا ——— اور یہ سب کام پورے صبر اور شکر کے ساتھ کئے تو امتحان کی اِس کامیابی کے بعد حضرتِ حق جل مجدہٗ نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو عالَم اِنسانیت کی پیشوائی کے منصبِ جلیل پر فائز کر دیا۔

اِبتلاء کی مذکورہ تفسیر حضرتِ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حافظ ابن کثیر رح لکھتے ہیں۔

ای جزاء علیٰ مَا فعل کما قام بالامر وترک الزواجر جعلہ اللہ للناس قدوۃ واماما۔ جلد اوّل صفحہ ۱۶۵	یعنی احکامِ الٰہی کی پابندی کے بدلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام پیشوائے عالم بنائے گئے۔

واضح رہے کہ "امامتِ عظمیٰ کا یہ منصب" نبوّت کی اعلیٰ ترین ترقی تھی جو نبوّت کے بعد عطا ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے نبی بنائے جا چکے تھے نبی بننے کے بعد خدا کی آزمائشوں میں سے کامیابی کے ساتھ نکلنے پر آپ کو اِمامت کا منصب دیا گیا ہے۔

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے اِس عظیم منصب کو بیان کرتے ہوئے قرآن کریم نے عملی جدوجہد کو کس طرح نمایاں کیا ہے اور کس طرح ایک رسول کریم کے لیے بھی عمل و قربانی کی ضرورت کو واضح کیا ہے وہ قابلِ غور ہے۔

نبوّت کے اعلان میں قرآن کریم نے کسی جگہ عمل، آزمائش اور قربانی کا تذکرہ نہیں کیا ہے بلکہ اِس اعلان کے لئے عام طور پر منتخب کرنے، چننے، برگزیدہ بنانے اور وحی بھیجنے کے الفاظ استعمال کیۓ ہیں بخلاف مراتب نبوت کے۔ مراتبِ نبوت کے تذکرہ میں عمل، قربانی اور جدوجہد کو نمایاں کیا گیا ہے۔ جیسے سورۂ نحل میں حضرت ابراہیم کے لئے فرمایا ہے۔

اجتبٰہ وھدٰہ الی صراط مستقیم	اِس کو اللہ نے چن لیا اور چلایا سیدھی راہ پر۔

دوسری مثال

سورۂ مریم میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی ہجرت کا ذکر کرتے ہوئے ایک عظیم انعام کا اظہار فرمایا ہے۔

فلما اعتزلھم وما یعبدون من دون اللہ وھبنا لہٗ اسحٰق ویعقوب ط

پھر جب جُدا ہوا اُن سے اور جن کو پوجتے تھے اللہ کے سوا بخشا ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب۔

سو برس کے بوڑھے ابراہیمؑ اور نوّے برس کی بڑھیا سارہ کو جب حضرت اسحاق کے پیدا ہونے کی خوش خبری دی گئی تو دونوں میاں بیوی نے تعجب کیا۔ حضرت سارہ نے مارے شرم کے منھ ڈھانپ لیا، فرشتہ بولا، تعجب کی کوئی بات نہیں، تم پر خدا کی رحمت اور برکت ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں۔

فلما اعتزل الخلیل اباہ وقومہ فی اللہ ابدلہ اللہ من ھو خیر لھم ووھب لہ اسحاق ویعقوب۔

جب خلیل نے خدا کی محبت میں اپنوں کو چھوڑا تو خدا نے اُن سے بہتر اُن کو عطا فرما دیئے یعنی اِسحاق جیسا بیٹا اور یعقوب جیسا پوتا۔

یہ عمر اس دور میں بھی اولاد ہونے کی نہیں تھی تب ہی تو انھوں نے تعجب کیا۔ لیکن حضرت ابراہیم نے اپنوں کو چھوڑ کر جس قربانی کا مظاہرہ کیا تھا اس کے نتیجہ میں یہ زبردست انعام ہوا۔

اِس انعام و اکرام میں بھی حضرت حق جل مجدہ نے قربانی کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خُدا کے لئے سب کو چھوڑا تھا

سب کو ٹھکرایا تھا اُسی کے نتیجے میں اُن کی اولاد کو آسمان کے تاروں کی طرح پھیلا دیا اور روشن کر دیا۔

تیسری مثال ــــــــ صبر و استقامت

انبیائے بنی اسرائیل کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔

وجعلنا ھم ائمۃ یھدون بامرنا لما صبروا۔ (سورۂ سجدہ)

اور بنائے ہم نے اُن میں رہنما، جو راہ چلاتے تھے ہمارے حکم سے۔ جب وہ صبر کرتے رہے۔

یعنی بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں کو پیشوائی اور رہنمائیِ قوم کا عہدہ دیا گیا وہ اُن کی صفتِ صبر و استقامت کی وجہ سے دیا گیا اور صبر و استقامت کی راہ نے اُنھیں اس منصب جلیل کا اہل بنایا۔

اس موقع پر بھی خدا تعالیٰ نے حُسنِ عمل کی اہمیّت کو واضح کیا اور یہ نکتہ عوام کے ذہن میں بٹھایا ہے کہ خدا تعالیٰ کا فضل و کرم تو اصل چیز ہے ہی مگر انسان کے اخلاق اور اس کا کردار بھی اس اسباب و وسائل کی دنیا میں خاص اہمیت رکھتا ہے اور قرآن نے انسانی عمل کو اسی لئے بنیادی اہمیت کے ساتھ پیش کیا ہے

چوتھی مثال، مَقامِ محمود!

مَقام محمود یعنی منصبِ شفاعت۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی

خصوصی فضیلت ہے، اِس فضیلت کو قرآنِ کریم نے جس انداز سے بیان کیا ہے
اس پر غور کیجیے۔

وَمِنَ اللَّیْلِ فَتَہَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ عَسٰۤی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا
(بنی اسرائیل)

اور کچھ رات جاگتا رہ، قرآن کے ساتھ یہ زیادتی ہے تیرے لئے، قریب ہے کہ کھڑا کر دے تجھ کو تیرا رب مقام محمود میں۔"

اِس سے پہلی آیتہ میں پانچ وقت کی نماز کا حکم ہے، یہ حکم ساری امت کے لئے ہے اور آپ کے لئے بھی ہے اِس حکم کے بعد تہجّد کی نماز کا حکم ہے۔ یہ حکم صرف آپ کے لئے مخصوص ہے، یعنی اُمّت پر پانچ نمازیں، اور پیغمبر پر چھ نمازیں فرض ہوئیں۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

"نیند سے جاگ کر (تہجد میں)، قرآن پڑھا کر، یہ حکم
سب سے زیادہ تجھ پر کیا ہے کہ تجھ کو مرتبہ (سب سے)
بڑا دینا ہے۔

وہ بڑا مرتبہ کیا ہے۔۔؟۔ اگلے ٹکڑے میں اِسی بڑے مرتبہ کو بیان کیا ہے کہ وہ بڑا مرتبہ مقام محمود ہے۔

سَرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس حکم کی تعمیل میں بڑی بڑی مشقّتیں اور تکلیفیں اُٹھائیں، تبلیغ وہدایت کے لئے دن بھر کام کرنے والے ہادی اعظم رات کو خدا کی عبادت کے لئے کھڑے ہوتے اور اتنی اِتنی دیر تک عبادت میں مشغول رہتے کہ پیر سوجھ جاتے، خون جھلکنے لگتا۔

قرآن نے کہا کہ نماز کے اِسی رشتہ سے حضور مقام محمود پر فائز ہوں گے اور نماز کے ساتھ حضورؐ کا اِس قدر شغف اور دِل چسپی حضورؐ کو تعریف کے منصب عظیم پر پہنچائے گی پھر اِس میں یہ بھی اِشارہ کر دیا کہ حضور کے مقام شفاعت سے وہی لوگ فائدہ اٹھائیں گے جن کا نماز سے گہرا تعلق ہوگا اور جتنا گہرا ہوگا قیامت کے دن وہ اتنا ہی زیادہ آپ کی شفاعت سے حصہ پائے گا

یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ نماز کی منادی " اذان " کے بعد وہ دعا پڑھی جاتی ہے ــــ جس میں حضور کے لئے مقام محمود کی دُعا کی گئی ہے۔

آپؐ کے لئے دعا ہم کرتے ہیں مقام محمود کی۔ حالانکہ مقام محمود کا وعدہ تو حضور سے کیا جا چکا ہے پھر ہماری دعا سے کیا فائدہ۔؟

ہماری دُعا دراصل ہمارے ہی لئے ہوتی ہے۔ حضور نے ارشاد فرمایا جو شخص اذان کے بعد یہ دعا پڑھے گا۔ اُس پر میری شفاعت واجب ہو جائیگی

ــــــــــــــــــــــــــــــ ابن کثیر بحوالہ مسلم

تو اِس دُعا سے فائدہ ہمیں پہونچا کہ حضورؐ کی شفاعت کے ہم مستحق قرار پا گئے۔

قرآنِ کریم کے اِس انداز بیان اور سیاق وسباق نے ہمیں یہ بتایا کہ مقامِ محمود جیسے عظیم مرتبہ کا نماز جیسی اہم عبادت سے بڑا گہرا تعلق ہے وہ سب سے بڑی فضیلت۔ یہ سب سے بڑی عبادت۔

بتائیے۔ جب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بزرگی اور یہ عظمت،

عبادت اور ریاضت کے ساتھ اس قدر گہرا رشتہ رکھتی ہے تو پھر بزرگی بغیر عمل انعام و اکرام بغیر جد وجہد کا تصوّر اسلام میں کتنا بعید ہو جاتا ہے

بعض مفسّرین نے لکھا ہے کہ مقام محمود کے بعد جس دُعا کا حکم سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے اس کا تعلق بھی نماز سے ہے دُعا یہ ہے۔

قل رب ادخلنی مدخل صدق	اے نبی۔! اس طرح دُعا کیا کیجئے۔
واخرجنی مخرج صدق	خداوندا داخل کر مجھکو سچّا داخل کرنا
واجعلنی من لدنک سلطانًا	اور نکال مجھکو سچّا نکالنا اور عطا کر
نصیرًا ط	مجھکو اپنے پاس سے حکومت کی مدد۔

یعنی خداوندا۔ مجھکو سچائی اور اخلاص کے ساتھ نماز میں داخل فرما، اور مجھے اسی سچائی اور حُسنِ نیت کے ساتھ نماز میں سے نکال، میری عبادت کا آغاز بھی اچھا ہو، اور انجام بھی اچھا ہو، ریاکاری اور دنیوی وساوس کو میرے قریب نہ آنے دے تاکہ اس عبادت کا ثمرہ اور اُس کے جو روحانی اثرات ہیں وہ پورے ظاہر ہوں۔

اس کی تائید میں ہمیں سورہ کوثر بھی ملتی ہے۔ جس میں "کوثر" کے وعدے کے بعد حضور ؐ کو نماز اور قربانی کا حکم دیا گیا ہے۔

مقامِ محمود پر۔ فائز ہو کر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ سے جو دُعا کریں گے اُس دُعا کے الفاظ بھی قابلِ غور ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب خدا تعالےٰ حضور کو ندا دے گا تو حضور اِن لفظوں میں اپنے پروردگار کو جواب دیں گے۔

لبّیک وسعدیک	الٰہی۔! میں حاضر ہوں حُسنِ اطاعت
والخیر فی یدیک	کے ساتھ حاضر ہوں، خیر و بھلائی
والشر لا الیک	تیرے ہاتھ میں ہے، برائی تیری
والمھدی من ھدیت	طرف سے نہیں ہوتی، ہدایت یافتہ
وعبدک بین	وہی ہے جس کو تو ہدایت دے۔ تیرا
یدیک وبک والیک	بندہ تیرے روبرو حاضر ہے وہ تجھ ہی
لا منجیٰ ولا ملجا منک	سے ہے اور تیری طرف لوٹ آیا ہے
الا الیک تبارکت و	نجات اور پناہ تیرے سوا کہیں نہیں
تعالیت سبحانک	ہے، تو بزرگ ہے، بزرگ تر ہے،
رب البیت	بیت مبارک کا رب ہے۔

ابن کثیر ج ۳ ص ۵۔

یہ دُعا ربار بار پڑھنے کے قابل ہے، کس قدر بندگی ہے، عجز و نیاز ہے، سجدہ میں سرِ مبارک جھکا ہوا ہے۔

پس کس قدر تعجب کی بات ہے کہ لوگ فضائل و کمالات کی باتیں کرتے ہیں اور ان کمالات کے اندر عبدیت اور فدویت کی جو روح کارفرما ہوتی ہے اس پر غور نہیں کرتے حالانکہ وہی عبدیت اور اطاعت کا جذبہ ان کمالات کی جان ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم پر غور کرنے سے اِس کی اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں، اس وقت چند مثالوں پر اکتفار کیا جا رہا ہے۔ اِن چند مثالوں کو سامنے رکھ کر اِس

بات پر غور کیجیے کہ قرآن کریم ایمان وعمل کی ضرورت کو ہر موقع پر کس طرح نمایاں کرتا ہے اور کس قوت کے ساتھ اس حقیقت کو بار بار دوہراتا ہے کہ دین و دنیا کی ہر بھلائی حُسنِ عمل کے ساتھ وابستہ ہے

حُسنِ عمل کی ضرورت کو نمایاں کرنے کے لیے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اعلان بھی بہت بڑا اثر رکھتا ہے۔ وہ اعلان جو سورۂ احقاف کی حسبِ ذیل آیت میں حضور سے کرایا گیا ہے۔

قل ما کنت بدعا من	تو کہہ ! میں کچھ نیا رسول نہیں
الرسل وما ادری	آیا اور مجھ کو معلوم نہیں کیا
ما یفعل بی ولا بکم	ہونا ہے مجھ سے، اور تم سے
ان اتبع الا ما یوحی	میں اُسی پر چلتا ہوں جو حکم آتا ہے
الیّ ۔ ط (سورۂ احقاف)	مجھ کو۔ (شاہ عبدالقادرؒ)

حضور نے اس اعلان میں کس چیز سے بے خبری کا اعلان کیا ہے۔۔۔؟ دنیا کے انجام سے یا آخرت کے انجام سے۔

اس آیت سے پیدا ہونے والے اعتراض کو سامنے رکھ کر مولانا عثمانیؒ نے اس آیت پر ایک نہایت واضح نوٹ لکھا ہے، فرماتے ہیں۔

مجھے اس سے سروکار نہیں کہ میرے کام کا آخری انجام کیا ہونا ہے میرے ساتھ اللہ کیا معاملہ کرے گا اور تمہارے ساتھ کیا کرے گا نہ میں اس وقت پوری پوری تفصیل اپنے اور تمہارے انجام کے متعلق بتلا سکتا ہوں کہ دنیا و آخرت میں کیا کیا صورتیں پیش آئیں گی۔ ہاں

ایک بات کہتا ہوں کہ میرا کام صرف وحی الٰہی کا اتباع اور حکم
خداوندی کا امتثال کرنا، اور کفر و عصیان کے سخت خطرناک
نتائج سے خوب کھول کر آگاہ کر دینا ہے، آگے چل کر دنیا اور آخرت
میں میرے اور تمہارے ساتھ کیا کچھ پیش آئے گا اس کی تمام تفصیلات
فی الحال میں نہیں جانتا نہ اس بحث میں پڑنے سے مجھے کچھ مطلب،
بندے کا کام نتیجے سے قطع نظر کر کے مالک کے احکام کی تعمیل کرنا
ہے اور بس۔ (سورۂ احقاف)

ایک نبی کو اپنے انجام کی بہتری، دینی اور دنیوی مقاصد میں کامیابی کا
پورا یقین ہوتا ہے، نبی کہتے ہی اُسی سچے انسان کو ہیں جسے اپنی سچائی کا کامل
یقین ہوتا ہے، وہ اپنے انجام کی بہتری کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اس کا
روشن مستقبل اس کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے وہ خدا کے کسی وعدہ کی طرف
سے ادنیٰ شک میں بھی مبتلا نہیں ہوتا اور خدا کا وعدہ اس کے ساتھ یہی
ہوتا ہے کہ۔

انا لننصر رسلنا و	ہم مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی
الذین آمنوا فی الحیوۃ	اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگانی
الدنیا و یوم یقوم الاشھاد	میں اور جب کھڑے ہوں گے گواہ۔

(مومن)

پھر اس آیت میں کس بات کی طرف سے بے خبری اور لاعلمی کا اظہار
کیا جا رہا ہے ______؟

مولانا عثمانی نے بتایا ہے کہ یہ لاعلمی انجام کی طرف سے نہیں، انجام کی تفصیلات کی طرف سے ہے، یہ تو آپؐ کو معلوم تھا کہ آپ دُنیا میں بھی کامیاب ہوں گے اور آخرت میں بھی مگر اس چیز کا علم نہیں تھا کہ آپؐ کو کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیئے کن کن منزلوں سے گزرنا پڑے گا، آپؐ کی کیسی کیسی آزمائشیں ہوں گی، آپؐ کے دشمنوں کو خدا تعالےٰ کن کن حالات سے —— کبھی خوش حالی کی ڈھیل سے —— کبھی مصائب کی سختیوں سے —— کس کس طرح آزمائے گا۔ یہ تفصیل خدا ہی جانتا ہے۔

آپ کہیں گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اِس قسم کی لاعلمی کا اعلان کرایا کیوں گیا۔؟ جبکہ اِس اعلان سے مخالفین کی طرف سے حضور کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلانے کا اندیشہ تھا۔ جیسا کہ آج بھی کچھ لوگ یہ کہتے ہوئے سُنائی دیتے ہیں کہ حضور کو یہ خبر نہ تھی کہ قیامت کے دن میرا انجام کیا ہوگا۔ (معاذ اللہ)

میں عرض کروں گا کہ اِس قسم کے احتمال کے باوجود قرآن نے آپ کی زبانِ مبارک سے یہ اعلان اِس لیئے کرایا۔ تاکہ نجات کے بارے میں، مذہبی گروہوں میں پھیلی ہوئی خوش فہمیوں کا ابطال ہو جائے۔ وہ خوش فہمیاں اہلِ کتاب میں تھیں، وہ کہتے تھے۔ ہم خدا کے اِکلوتے بیٹے ہیں، جہنم ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہے ہم تو جنتی ہیں۔ مُشرکینِ مکہ کہتے تھے۔ ہمارے پاس بڑے بڑے سفارشی ہیں۔ ہمیں عذابِ آخرت کا، اگر وہ کوئی حقیقت ہے کوئی فکر نہیں۔

حضور نے فرمایا، تم تو کیا چیز ہو۔ میں خدا کا اِس قدر پیارا ہونے کے

باوجود اپنے انجام کی طرف سے ہر وقت ڈرتا رہتا ہوں، میرا فرض تو بس یہ ہے، کہ میں حُسن اطاعت کا ثبوت دوں، حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کروں، اور خداوندی ہدایات پر زندگی بسر کرتا رہوں۔

یہ اعلان اِس عظیم فائدہ کو سامنے رکھ کر کرایا گیا، اور اِس طرح حسنِ عمل کی اہمیت اور جدوجہد کی ضرورت کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے واضح کیا گیا، اس سے لوگوں نے اِس بات کو سمجھا کہ جب ہادیِ اِسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اتباعِ وحی اِس قدر ضروری ہے تو ہم کس گنتی میں ہیں۔ بس لوگوں کے سارے گھمنڈ ٹوٹ گئے، جھوٹی توقعات کے کمزور گھروندے ڈھے گئے۔

آیت کریمہ کی اِس روح کو وہ حدیث بالکل واضح کر دیتی ہے جو حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی وفات کے واقعہ پر مشتمل ہے حدیث ملاحظہ ہو۔

حضرت اُم علاء فرماتی ہیں۔ مہاجرین میں سے حضرت عثمان رضؓ کی کفالت میرے حصے میں آئی، عثمان رضؓ کچھ دنوں کے بعد بیمار پڑ گئے، بیماری جان لیوا نکلی اور حضرت عثمان رضؓ کا وصال ہو گیا۔ ہم نے حضرت عثمان رضؓ کو نہلایا اور کفنا کر تیار کر دیا اتنے میں حضورِ اکرم تشریف لائے۔ میں نے حضور کے سامنے حضرتِ عثمان رضؓ کی لاش کو مخاطب کر کے کہا۔

رحمۃ اللہ علیک اباالسائب شہادتی علیک لقد اکرمک اللہ

ابو سائب! تم پر خدا رحم فرمائے، تمہارے لئے تو میری گواہی ہے کہ تم پر خدا تعالیٰ رحم فرمائے گا

حضور نے میری بات سنکر فرمایا۔

وما یدریک ان اللہ تعالیٰ اکرمہ۔؟

اُم علا۔ تمھیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ ابو سائب پر خدا نے کرم فرمایا۔

ام علاء کہتی ہیں، میں نے عرض کیا۔ میرے ماں باپ قربان ہوں حضور پر، مجھے کیوں نہیں معلوم۔

اما ھو۔ فقد جاءہ الیقین من ربہ وانی لارجولہ الخیر۔

ابو سائب کے پاس تو خدا کے پاس سے یقین یعنی موت آگئی اور میں اُن کے لئے بھلائی کی اُمید کرتی ہوں۔

حضور نے ارشاد فرمایا۔

واللہ ما ادری وانا رسول لہٗ ما یفعل بی قالت

فقلت واللہ لا ازکی احداً ابعدہ ابداً واحزننی ذلک۔ فنمت فرأیت لعثمانؓ عیناً تجری فجئت الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاخبرتہ بذلک فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

"ذاک عملہ"

اور خدا کی قسم میں نہیں جانتا حالانکہ میں خدا کا رسول ہوں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا۔

میں نے عرض کیا۔ حضور! آج کے بعد میں کسی کی اِس طرح پاکیزگی نہیں بیان کیا کروں گی لیکن آپ نے جو کچھ فرمایا۔ اس سے میں بڑی رنجیدہ ہوئی، رات کو عثمانؓ میرے خواب میں آئے۔ کہ حضرت عثمانؓ کی ایک نہر ہے جو بہہ رہی ہے۔ صبح اُٹھ کر یہ خواب حضور کو سنایا۔ آپ نے ارشاد

فرمایا۔ نہر کی شکل میں عثمان رض کا عمل خیر
دکھایا گیا ہے۔

اس حدیث نے بتایا کہ کسی انسان کے مستقبل کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا اور نہ کچھ کہنا چاہیئے نہیں کہا جا سکتا کہ انسان کی عملی زندگی خدا کے ہاں قبول ہوئی یا نہیں۔ بس انسان کے بارے میں اچھی اُمید ہی قائم کی جا سکتی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

حضورؐ نے اس موقع پر یہ جملہ اپنے متعلق استعمال کیا کہ میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ پھر دوسرے انسانوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ جب مجھے یہ جرأت نہیں ہوتی تو دوسرے کو اس قسم کی جرأت کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے۔

اس جملہ کا مقصد مخاطب کو متاثر کرنا تھا چنانچہ اس نفسیاتی جملہ نے حضرت اُم علاء کو بے حد متاثر کیا اور انھوں نے ہمیشہ کے لئے عہد کر لیا کہ آئندہ میں کسی شخص کے بارے میں یقینی نجات کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوا کروں گی۔

سورۂ احقاف کی مذکورہ آیت اور ام علاءؓ انصاریہ کی اس حدیث میں حضور کی طرف سے "لاعلمی کے اظہار" پر جو اشکال پیدا ہوتا ہے اس سے بچنے کے لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول تو یہ ہے۔

سورۂ احقاف کی آیت منسوخ ہے۔ سورہ فتح کی آیت لیغفر اللہ سے
جس میں حضور کی مغفرت کا اعلان کیا گیا ہے۔

یعنی اس آیت کے نزول تک حضور لاعلم تھے پھر آپ کو مغفرت کی خبر دے دی گئی حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ منسوخ کہنے کی بجائے یہ فرماتے ہیں۔

اِس لاعلمی کا تعلق "دنیوی انجام" سے ہے یعنی میں نہیں جانتا کہ دنیا میں قتل کیا جاؤں گا، گھر سے بے گھر کیا جاؤں گا۔ یا پھر کیا ہو گا۔

ضحاک فرماتے ہیں۔ اس کا تعلق اوامر و نواہی سے ہے یعنی میں نہیں جانتا کہ آئندہ مجھ پر کونسا حکم نازل ہوگا اور کس چیز کی نہی کی جائے گی۔

ابنِ جریرؒ نے امام حسن بصریؒ کے قول کو ترجیح دی ہے اور اسی کو ابنِ کثیر نے اختیار کیا ہے۔ لیکن اصحابِ نظر ادنےٰ توجہ سے یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ توجیہاتِ مذکورہ میں سے کوئی توجیہ ایسی نہیں جو اشکال سے محفوظ ہو۔

اِشارۃً عرض کرتا ہوں۔ نبوّت اور عصمت لازم و ملزوم ہیں، نبی کو روزِ اوّل ہی سے اپنی عصمت کا یقین ہوتا ہے اور جسے اپنی عصمت کا یقین ہوتا ہے اُسے نجاتِ اُخروی کا یقین بھی ہونا ضروری ہے۔ اس طرح یہ بات بھی واضح ہے کہ آیت اور حدیث دونوں کے سیاق و سباق میں آخرت کا ذکر ہے اور دونوں جگہ نجاتِ اُخروی کے بارے میں اِس خوش فہمی کی تردید ہے جو اُس وقت بے عمل قوموں میں پھیلی ہوئی تھی۔

خلاصہ یہ نکلا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی دنیوی کامیابی میں یقین تھا اور اُخروی نجات کا بھی اور بحیثیت نبی آخرالزماں کے آپ کو دنیوی یا دینی مستقبل کے بارے میں کسی قسم کا شک و شبہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ البتہ تفصیلات کا علم خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اِسی تفصیل سے آپ نے لاعلمی کا اظہار فرمایا ہے۔ رہا الفاظ کا مقصد تو میں نے عرض کیا کہ مطلق الفاظ میں اسطرح نفی کر کے آپؐ نے حسنِ عمل کی اہمیت کو برقرار رکھا ہے اور خوش فہمیوں کی تردید فرمائی ہے

امام غزالیؒ کی تصریح

کہا جاتا ہے کہ صوفیائے کرام کے ہاں حسنِ عمل کی اِتنی اہمیت نہیں جتنی کہ ارباب علم وفقہ کے نزدیک ہے، صوفیاء تو صرف محبّت کو کافی سمجھتے ہیں، اِسی غلط فہمی کی وجہ سے کام چور لوگ اہل شریعت سے دُور رہتے ہیں اور ارباب تصوّف صوفیوں اور پیروں کے پیچھے پھرتے ہیں حالانکہ یہ خیال حضرات صوفیہ پر بہت بڑا الزام ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ صوفیائے کے امام مسلّم ہیں اور احیاءُ العلوم ان کی مشہور کتاب ہے۔ حضرت امامؒ نے محبت اور دوستی کی فضیلت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ابن سماکؒ نے اپنی موت کے وقت کہا۔

اللھم انک تعلم انی اذا کنت اعصیک کنت احب من یطیعک فاجعل ذالک قرابۃ لی الیک۔

خداوندا۔! تو جانتا ہے کہ میں ہر چند تیری نافرمانی کرتا تھا مگر تیرے فرمانبردار بندوں کے ساتھ محبت ضرور کرتا تھا۔ الٰہی میری اِس عادت کو اپنے قرب کا ذریعہ بنالے یعنی مجھے بخش دے

اِس قسم کی باتوں سے عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مقبولانِ بارگاہ کے ساتھ محبّت رکھنا ہی نجات کا سبب ہوجاتا ہے اِس لئے امام غزالیؒ نے اِس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لئے ابن سماکؒ کی اِس دُعا کے بعد امام حسن بصریؒ کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔

قال الحسن ضدہٗ

ابن سماک کی اِس دعائے کے برعکس امام حسن بصریؒ کہتے ہیں۔

یا ابن آدم لا یغرنک قول من یقول المرء مع من احب فانک لن تلحق الابرار الا باعمالھم فان الیھود والنصاریٰ الیٰ آخرہ۔

اے انسان! تجھے یہ قول دھوکے میں نہ ڈالے کہ انسان اُسی کے ساتھ ہوتا ہے جس کے ساتھ محبت کرتا ہے، یقین کر کہ نیک لوگوں کے ساتھ تیرا حشر نہیں ہو سکتا جب تک کہ تو اُن جیسے کام نہ کرے، دیکھ یہود و نصاریٰ اپنے پیغمبروں کے ساتھ محبت رکھتے ہیں لیکن وہ ان پیغمبروں کے ساتھ نہیں۔

اس کے بعد امام غزالی رح لکھتے ہیں۔

ھذا اشارۃ الی ان مجرد ذالک من غیر موافقۃ فی بعض الاعمال اوکلھا لا ینفع

یہ اِشارہ ہے کہ محض محبت رکھنا کافی نہیں ہے بغیر اِس کے کہ تمام اعمال یا بعض اعمال میں اُن کی پیروی کی جائے (یہ اِشارہ امام حسن بصریؒ کے قول میں ہے)

اِس کے بعد فضیل بن عیاض رح کا قول اُس کی تائید میں نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قال الفضیل فی بعض کلامہ تریدان تسکن الفردوس وتجاور الرحمٰن فی دارہ مع النبیین والصدیقین

فُضیلؒ نے اپنے ایک وعظ میں فرمایا۔ ہاں تو فردوسِ بریں میں رہنا چاہتا ہے اور خدا کا قرب بھی! اُس کے رسولوں صدیقوں کے ساتھ

والشهداء و الصالحین	شہیدوں اور صالحین کے ساتھ ،
بای عمل عملتہ ؟	ـــــ کونسا عمل کیا تونے ۔ ؟
بای شھوۃ ترکتھا ؟	کس خواہش کو تونے چھوڑا ـــ ؟
بای غیظٍ کظمتہ ـــ ؟	کونسا غصہ تو پی گیا ـــ ؟
بای رحم قاطع وصلتہ ـ ؟	کس ٹوٹے ہوئے رشتہ کو تونے جوڑا ۔ ؟
بای ذنب غفرتہ ـــ ؟	اپنے بھائی کی کونسی خطا معاف کردی ؟
بای قرب باعدتہٗ فی اللہ ؟	کس دوست کو تونے خدا کے لئے چھوڑا ؟
بای بعد قاربتہ فی اللہ ؟	کس دشمن سے تونے خدا کے لئے دوستی کی ؟

سلف کی مزید توضیحات

شیخ اکبرؒ کے عقائد میں امام شعرانی رح کی کتاب "الیواقیت" اِس وقت پیش نظر ہے ۔ امام نے شیخ کے خیالات کی وضاحت میں جو کچھ لکھا ہے وہ ملاحظہ ہو

سوال ۔ کیا نبی کی نبوت مکتسبہ ہوتی ہے جس طرح نبی کی ولایت مکتسبہ ہوتی ہے

جواب :۔ ولایت ولی کی ہو یا نبی کی مکتسبہ ہوتی ہے ۔ کسب سے جو چیز خارج ہے وہ صرف نبوت ہے ۔ اِس کی وضاحت یہ ہے ۔

حضرت حق نے اپنے علم سابق کے مطابق اپنی مخلوق کو مختلف مراتب پر تخلیق فرمایا ہے ۔ فرشتوں کو فرشتہ بنایا جن کو رسول بنانا تھا وہ رسول بنائے گئے ، اولیاء اولیاء بنے ۔ مومنین مومنین ۔ جو اُس کے علم میں کافر و منافق تھے وہ کافر و منافق بنا دیئے گئے ۔

حضرتِ حق کے نزدیک اُن میں سے ہر گروہ علیحدہ ہے نہ اس میں کوئی

زیادتی ہے نہ کمی، نہ ایک گروہ کا آدمی دوسرے گروہ سے تبدیل ہوتا ہے۔ نہ ایک درجہ کا آدمی دوسرے درجہ میں داخل ہوتا ہے، اگر ایسا ہوتا تو نبوت کا مرتبہ مکتسبہ ہو جاتا، اور غیر نبی "نبی" ہو جاتا۔

سوال :۔ کیا ایک نبی کا اجر اُس کی نیت، عزم، راہ ہدایت میں مصائب کی کمی بیشی کے لحاظ سے بڑھتا اور گھٹتا رہتا ہے۔

جواب :۔ ہر نبی کو اتنا ہی اجر ملتا ہے، جتنی وہ نبی دعوت و تبلیغ کے راستہ میں مخالفین کے ہاتھ سے تکلیفیں اُٹھاتا ہے

سوال :۔ کیا ایک رسول کو اجر ملتا ہے جبکہ اس کی دعوت کو اس کی قوم رد کر دے اور قبول نہ کرے۔

جواب :۔ "ہاں"۔ ملتا ہے جتنی بار اس کی قوم رد کرتی ہے اور وہ دعوت دیتا ہے اُتنا ہی اجر ملتا ہے۔

(الیواقیت صہ۷۹ و صہ۱۸۱)

اوپر نبی کی ولایت کا تذکرہ ہوا ہے۔ یہ ولایت نبی کیا ہے ؟
اس کی تشریح خود شیخ سے سنئے۔ شیخ کا مشہور مقولہ ہے کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہوتی ہے۔

ولایت نبی کیا ہے ؟

شیخ فرماتے ہیں نبی کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔

۱۔ ایک حیثیت تعلق مع اللہ۔ ۲۔ ایک حیثیت تعلق مع المخلوق

ع ۔ اِدھر اللہ سے واصل، اُدھر مخلوق میں شامل

وصول اور شمول کی اِن ہی دونو حیثیتوں کا نام رسالت ہے
اِن دونوں حیثیتوں میں۔ ۱۔ ایک (تعلق ربانی) دائمی ہے۔ جو کسی وقت منقطع نہیں ہوتی۔
دوسری حیثیت (تعلق اِنسانی) منقطع ہوجاتی ہے۔ صرف اِصلاح وتبلیغ تک وہ تعلق قائم رہتا ہے۔
ظاہر ہے کہ تعلق مع اللہ کی حیثیت افضل ہے تعلق مع الخلق سے اِس لیے بھی کہ وہ دائمی ہے اور اِس وجہ سے بھی کہ متعلق بہ یعنی ذات حق افضل ہے۔
پس تعلق مع الحق کی حیثیت کا نام ولایت ہے اور اسی کو شیخ نبی کی دوسری حیثیت سے افضل قرار دیتے ہیں۔

حاصل یہ نکلا۔

۱۔ نبی کا "مقام ولایت" کسبی ہوتا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ نبی کی محنت اور سعی پر اُس کے درجہ کی کمی بیشی کا دارومدار ہوتا ہے۔

۲۔ ہر نبی کے اجر و ثواب کی کمی زیادتی بھی اس نبی کی جد وجہد اور دعوت کی راہ میں مشقت اور تکلیفوں سے وابستہ ہوتی ہے۔
بطور کلیہ ایک جگہ شیخ فرماتے ہیں۔

کل امر مامورٌ بہٖ فھو کسبیٌ ——— ہر وہ کمال جس کے حاصل کرنے کا نبی کو حکم دیا جاتا ہے وہ کسبی ہوتا ہے، پس اجر و ثواب ہو یا ولایت اِس اصول پر مکتسبہ ہونے چاہئیں، نہ کہ موہوبہ۔

وہبی ہونے کا مفہوم

اِس وضاحت سے ہم وہبی اور کسبی کا مفہوم متعین کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ہر امر مامور بہٖ کسبی کہلاتا ہے۔ ہر انسان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مولیٰ کا زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرے۔

وابتغوا الیہ الوسیلۃ وجاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون ط۔

اپنے تمام خاص بندوں کے متعلق ارشاد فرمایا :-

اولئٰک الذین یدعون یبتغون الیٰ ربھم الوسیلۃ ایھم اقرب۔

خدا کا ہر خاص بندہ اِس حکم کی تعمیل میں مشغول ہے۔

نبوت مامور بہٖ نہیں ہے، کسی جگہ حضرتِ حق نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم نبی بننے یا مقامِ نبوت حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

فرقِ مراتب کا تعین

حضراتِ مرسلین کے درمیان "فرقِ مراتب" نفسِ نبوت کے لحاظ سے نہیں ہے۔ حقیقتِ نبوت میں تو تمام رسول مشترک ہیں۔ فرقِ مراتب اگر ہے۔ تو۔ مقامِ ولایت کے لحاظ سے، تعلق مع الحق کی کمی بیشی کے لحاظ سے، اجر و ثواب کے درجے کے لحاظ سے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اللہ معنا   اپنی ذات سے ذاتِ حق کو مقدم فرمایا

یہ تعلق مع الحق کے کمال کی دلیل ہے۔

"خدا ہم سب کے ساتھ ہے" اجتماعیت کا لحاظ فرمایا

پوری اجتماعی زندگی کو اپنے ساتھ معیت الٰہی کے اندر لے لیا۔ یہ تعلق مع الخلق کا کمال ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ان معی ربی۔ بیشک میرے ساتھ میرا رب ہے۔ اس میں نہ وہ تقدم حق ہے نہ اجتماعیت ہے۔

یہ واضح رہے کہ انبیاء علیہم السلام کو نفس نبوت میں جو مشترک کہا گیا ہے اس سے حضور اقدس صؐ کی ذاتِ مقدسہ مستثنیٰ ہے کیونکہ حضور محض نبی نہیں بلکہ خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں۔ آپ کی نبوت "مبداء نبوت" اور "ختم نبوت" ہے۔

پس جب فرقِ مراتب ولایت کے لحاظ سے ہوا۔ تو ظاہر ہے یہ فرق مراتب امور مکتسبہ میں سے ہوا اسے وہبی نہیں کہا جا سکتا۔

یہیں یہ بات بھی صاف ہو جانی چاہیے کہ چونکہ نبوت ظاہر ہے اور ولایت غیر ظاہر اس لئے ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ حضرتِ موسیٰ نبی ہیں لیکن یہ نہیں معلوم کہ گروہ انبیاء میں اُن کا مرتبہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام کے درمیان مراتب کے تعین پر کوئی تصریح نہیں ملتی۔

شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ نے صاف انکار کر دیا کہ ہمیں انبیاء کرام کے مراتب کو متعین کرنے کا مذاق حاصل نہیں ہے، ہم تو تمام رسولوں کو اس طرح دیکھتے ہیں جس طرح پانی میں تاروں کو دیکھتے ہیں۔

(بحوالہ الیواقیت امام شعرانی رح صفحہ ۱۵۷)

ایک مکتوب میں حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مشہور جلیل القدر رسولوں کے فرقِ مراتب کا تعین کیا ہے لیکن اس کا تعلق حضرت مجدد صاحب کے کشف سے ہے کوئی نص اس پر ناطق نہیں ہے۔ (رسالہ مبدا و معاد)

امام شعرانی رح نے ترجمان الاشواق کی شرح کے حوالہ سے شیخ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

خدا تعالٰی نے حضرت آدم علیہ السّلام کو اپنے یدِ قدرت سے پیدا کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرفِ ہمکلامی سے مشرف فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شرفِ خلّت بخشا۔ حضرت یعقوب کو صفوت کی عزت بخشی۔

یہ سب صفات مجد و شرف ہیں لیکن ان اوصاف کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خلقِ الٰہی افضل ہے کلامِ الٰہی سے یا کلامِ الٰہی افضل ہے خلقِ الٰہی سے کیونکہ یہ ساری صفات اسی ذات سرچشمۂ کمالات کی طرف لوٹتی ہیں جو نہ کثرت قبول کرتی ہے۔ اور نہ عدد۔ اور یہ تمام اوصاف پرتو ہیں اسمائے الٰہیہ کے اور اسمائے الٰہیہ کے متعلق کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ ان میں بعض افضل ہیں اور بعض مفضول ہیں۔

معلوم ہوا کہ اِن خصوصیات کی وجہ سے فرق مراتب کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ فرق مراتب کا تعین ہر نبی کے مقام ولایت کو سامنے رکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ کام کرتے تو خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ہی کرتے جیسے آپ نے۔

لا تفضلوا بین الانبیاء کی ہدایت فرما کر دوسروں کے لئے بھی ممنوع قرار دیا اور خود بھی کوئی تصریح نہ فرمائی۔

اب غور کیجئے کہ ہر نبی کی زندگی میں انفرادی عبادت کے لئے جد وجہد اور لگن اور تبلیغ دین کے لئے جان کھپانے کی حد تک کوشش کیوں ہوتی تھی، اگر نبوّت کی طرف سے خدا کے رسولوں کو اطمینان ہوتا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ قیامت کے دن تبلیغ و دعوت کے سلسلے میں اگر ہم مسئول ہوں گے بھی تو اقوام پر اتمام حجّت کے لئے مسئول ہوں گے ورنہ جہاں تک ہماری دعوت کا تعلق ہے وہ خدا کی مشیت کے تحت جس قدر پھیل سکے گی ضرور پھیلے گی۔ جس ذات نے نبوّت دی ہے اور پھر معصوم عن الخطا والقصور ہونے کا وعدہ کیا ہے وہ ذات خود ہی ہمارے پیغام کی اشاعت کے لئے فضا سازگار کرے گی، دلوں کو ہماری طرف موڑے گی جس حد تک اُس کو منظور ہوگا۔

ولو شاء اللہ لھدٰکم اجمعین

اِس یقین واطمینان کا تقاضا تھا کہ ہر نبی تبلیغ کے حکم خداوندی کی تعمیل میں سرگرم عمل رہے لیکن فکر و تعب سے زندگی کو دوچار نہ ہونے دے۔ اور فکر و دِل سوزی بھی معمولی درجہ کی نہیں اس درجہ کی تھی کہ خود حق جل مجدہ کو یہ کہنا پڑا۔

فلا تبتئس بما کانوا یفعلون ؕ (سورہ ہود)

اے نوح۔! جو کام وہ کر رہے ہیں اس کا غم نہ کرو۔

اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دِل سوزی اور قریش کے ایمان نہ لانے سے

اندر ہی اندر گھٹنے کی کیفیت تو اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ حضرت حق کو یہ کہنا پڑا۔

فلعلک باخع نفسک ان لا یکونوا مومنین ؕ (سورۃ)

اے نبی۔ ! کیا تو اپنے آپ کو ہلاک کر دے گا اس بات پر کہ وہ ایمان کیوں نہ لائے۔

خیال فرمائیے۔ خدا کے رسولوں کو نہ منصب نبوّت سے معزول ہونے کا خطرہ ہے، نہ آخرت کی جواب دہی کا اندیشہ ہے پھر تبلیغِ حق کے لئے یہ تڑپ ہے، یہ دل سوزی ہے آخر کیوں۔؟

اور دیکھئے۔ ایمان و اسلام کو قبول کرانے کے معاملہ میں نبی کی۔ بے بے اختیاری کا یہ حال ہے۔

انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء

اے رسول۔ ! جس کو تم چاہو ہدایت پر لانا۔ تو تم نہیں لا سکتے۔ لیکن جس کو خدا چاہے اُسے وہ ہدایت دے سکتا ہے۔

ہدایت کے معاملہ میں اس بے اختیاری، نبوّت کی طرف سے اطمینان و یقین، اپنی عصمت کے وعدے پر اعتماد کے باوجود آخر اس دِل سوزی، فکر د تعب اور بے پناہ تکلفیں اُٹھانے کی کیا وجہ تھی۔؟

وجہ یہ تھی کہ دعوت الی اللہ اور عبادت الٰہی کے باب میں ہر رسول کرم کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ صفِ انبیاء میں اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ حاصل کرے اور قربِ الٰہی میں اُسے اونچے سے اونچا مقام حاصل ہو۔

خاتم المرسلین علیہ السلام کو اپنی افضلیت کا علم تھا لیکن آپ کی جدوجہد بھی اِس ظاہری حیات کے آخری سانس تک جاری رہی تاکہ آپ افضل الرسل ہونے کی حیثیت سے اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبۂ عبدیت پر فائز ہوں، اور زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب کے مستحق ہوں۔

اِن مراتب کے لئے مقامات کا لفظ استعمال کر لیجیے، فضائل کہہ دیجیے یا حیاتِ مادّی کے لحاظ سے روحانی ترقی کا آخری درجہ کہہ دیجیے۔ اِسی درجہ کے لحاظ سے ایک نبی دوسرے نبی کے مقابلے میں افضلیت یا مفضولیت کا مستحق ہوتا ہے اور اسی درجہ کے لحاظ سے ایک رسول کی زندگی بے اختیاری اور جبر سے نکلکر اختیار و ارادے کے دائرے میں داخل ہوتی ہے۔ اور ہر نبی اِس آیۃ کریمہ کے عموم میں آجاتا ہے۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا و ان اللہ لمع المحسنین ۝ (عنکبوت)

اور جنہوں نے ہمارے واسطے محنت کی ہم ان کو اپنی راہیں سجھا دیتے ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ہدایت کے مختلف درجے ہیں، عوام کی ہدایت اور ہے اور جو خود دوسروں کے ہادی ہیں اُن کی ہدایت اور ہے۔ اس آیت پر مولٰنا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا حاشیہ ملاحظہ ہو۔

جو لوگ اللہ کے واسطے محنت اُٹھاتے اور سختیاں جھیلتے ہیں اور طرح طرح کے مجاہدات میں سرگرم رہتے ہیں اللہ تعالےٰ

اُن کو ایک خاص نورِ بصیرت عطا فرماتا ہے اور اپنے قرب و رضا
یا جنّت کی راہیں سجھاتا ہے، جوں جوں ریاضت میں ترقی کرتے ہیں
اُسی قدر اُن کی معرفت و انکشاف کا درجہ بلند ہوتا ہے اور وہ
باتیں سوجھنے لگتی ہیں کہ اوروں کو اُن کا احساس تک نہیں ہوتا۔
مولٰنا زاہد الحسینی صاحب نے یہ توضیح لکھا ہے۔ کہ
نبوّت تمام مقامات سے ارفع و اعلیٰ ہے —— لیکن مولنا کو
اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ —— معرفت ذات
بھی بہت وسیع ہے صرف نبی نہیں بلکہ خاتم الانبیاء کو اس اعتراف کے سوا
چارہ نہ ہوا۔

ما عرفناک حق معرفتک ما عبدناک حق عبادتک

اسی میدان کے انکشافات و تجلّیات کے حصول کے لئے نبی جیسے رفعت
مقام انسانِ کامل کو شب و روز کے مجاہدات میں سرگرم رہنا پڑتا ہے مگر
پھر بھی امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ ؎

گر ہمہ مردم و ملک خاک شوند بر درت دامنِ عزت ترا، گردِ زوال کے رسد
کنگر کبریائے تو ہست فراز لامکاں طائر ما و آں ہوا بے پر و بال کے رسد

آپ فرماتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے مقامات و درجات وہبی
ہوتے ہیں۔"
اگر وہبی ہوتے ہیں تو کیا
ا —— نبوّت کی طرح ہر نبی کو اس کا علم و ادراک عطا کیا جاتا ہے کہ گروہ انبیاء

میں اس کا درجہ کیا ہے۔

۲۔ اس مرتبہ کے تحفظ کا یقین دلایا جاتا ہے یعنی جو مرتبہ اے رسول! تم کو عطا کیا جا رہا ہے خدا تعالیٰ اس کی حفاظت کرے گا۔

۳۔ کیا نبوت کی طرح اس مرتبہ پر ایمان لانا ضروری ہے ——— ؟

اگر ایسا ہوتا تو حضرات مرسلین ؑ کی زندگی خیر و فلاح کی جان توڑ جد و جہد کا اتنا اونچا نمونہ نہ ہوتی اور نیکیوں کے میدان میں مسابقت و مسارعت اور دوڑ دھوپ کا وہ بے مثال مظاہرہ نہ ہوتا جو نظر آتا ہے اعمال کے لئے سعی ہوتی لیکن برائے بیت ہوتی، ضابطہ والی ہوتی، اصلاح مخلوق کے لئے انبیاء کرام نے جو بے مثال جد و جہد فرمائی اس میں بھی وہ لگن نہ ہوتی جو اب اس جد و جہد کا طرۂ امتیاز ہے۔

سورۂ مزمل کی ابتدائی آیات پر غور کیجئے۔

انا سنلقی علیک قولاً ثقیلا
ان ناشئة اللیل ھی اشد
وطاً واقوم قیلا ؕ
(سورہ مزمل)

اے نبی۔ ! ہم تجھ پر ایک وزن دار بات ڈالنے والے ہیں، البتہ رات کو اٹھنا سخت روندتا ہے اور بات سیدھی نکلتی ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب موضح القرآن میں فرماتے ہیں۔

"یعنی ریاضت کر تو بھاری بوجھ آسان ہو"

حضرت عثمانی رحمہ اللہ کی یہ تشریح بھی ملاحظہ فرمائیے۔

اس کی تلاوت میں رات کو مشغول رہا کریں اور اس عبادت
خاص کے انوارات سے اپنے تئیں مشرف کر کے اس فیض اعظم کی
قبولیت کی استعداد اپنے اندر مستحکم فرمائیں۔ (حمائل شریف ص۵۸۳)

مطلب یہ کہ حضرات انبیار کی عبادت وریاضت ان پر
نئے اثراتِ فضیلت مرتب کرتی ہے، یہ روحانی ترقی ہے اور اسی ترقی کی انتہا
سے اس نبی کا درجہ دوسرے رسولوں میں متعین ہوتا ہے۔

میں نے خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال دی ہے۔ آپ کو
یہاں ایک الجھن روک سکتی ہے، آپ کہہ سکتے ہیں۔ حضور کا درجہ صفِ
انبیار میں متعین تھا خود آپ نے اعلان کیا تھا۔ انا سیّد ولد آدم
پھر آپ کی جد وجہد کس مقصد کے لئے تھی۔؟

دوسری الجھن یہ کہ کیا انبیار سابقین میں سے کوئی نبی اپنی جدّو
جہد سے خاتم المرسلین یعنی ختم نبوّت کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔؟

ان دونوں اشکالات کا جواب میرے پاس یہ ہے کہ ختم نبوت،
مطلق نبوّت کی طرح منصب تھا۔ مرتبہ نہیں تھا اس لئے ختم نبوت کسی نبی
کی جد وجہد سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اگرچہ
اپنے منصبِ جلیل کے لحاظ سے خاتم المرسلین اور امام الانبیار تھے لیکن
آپ امام المرسلین ہونے کی حیثیت سے قربِ الٰہی میں اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ
حاصل کرنے کے لئے جد وجہد فرمایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عطا کہتے ہیں۔
بعد از خدا بزرگ" شان رکھنے والے نبی معظم کا حقیقی مرتبہ قیامت کے

دن ہی نمایاں ہوگا۔ وہیں نظر آئے گا کہ آپ کا درجہ رفیعہ کیا ہے۔
آپؐ کے اسی درجہ کا تعلق تہجد والی آیت نماز سے قائم کر کے مذکورہ حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے

مولانا زاہد الحسینی صاحب نے سورہ بقرہ کی آیتِ تفضیل سے یہ ثابت کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مراتب منجانب اللہ تعالیٰ عطا شدہ ہیں۔ آگے فرماتے ہیں۔ "کسبی نہیں وہبی ہیں"

اول تو "عطا شدہ" اور "وہبی" ایک چیز نہیں، وہبی ایک خاص اصطلاح ہے جس کا مفہوم اوپر بیان کیا گیا۔ عطا شدہ کا مفہوم عام ہے، عطا شدہ ایک درجات نبوت ہی کیا، ہر چیز عطائے الٰہی ہے۔ کونسی چیز ایسی ہے جو خدا کی طرف سے عطا شدہ نہیں ہے

مولانا نے آیتِ مذکورہ سے اس لئے استدلال کیا ہے کہ اس آیت میں حضرت حق نے فضیلت کو اپنی طرف منسوب کیا ہے، لیکن فضیلت کو اپنی طرف منسوب کرنے سے فضیلت کا وہبی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔
حسبِ ذیل آیات پر غور کر کے بتائیے کہ کیا ان میں بھی فرق مراتب کے وہبی ہونے پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔

اھم یقسمون رحمۃ ربک ؕ نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیوٰۃ الدنیا و رفعنا بعضھم فوق بعض درجات	کیا وہ تیرے رب کی رحمت کو بانٹتے ہیں، ہم نے بانٹ دی ہے دنیا کی زندگی میں اُن کی روزی اور بعض کے درجے بعض پر بلند کر دیئے۔

لیتخذ بعضھم بعضا سخریا (سورۂ زخرف) کہ ایک دوسرے کو خدمت گزار ٹھیراتا ہے۔

روزی کی تقسیم حضرت حق کی طرف منسوب ہے، کسی کو فقیر اور کسی کو غنی کرنا بھی خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہے۔ تو کیا معیشت میں فرق مراتب بھی وہبی ہو گیا۔؟۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرماتے ہیں۔

انظر کیف فضلنا بعضھم علیٰ بعض وللاٰخرۃ اکبر درجات و اکبر تفضیلا ؕ دیکھ! ہم نے ایک کو ایک سے کیسا بڑھایا۔ اور پچھلے گھر میں اور بھی بڑے درجے ہیں اور بڑی فضیلت ہے۔

مولینا عثمانی رح فرماتے ہیں، دنیوی زندگی میں مال و دولت، عزت و حکومت، اولاد وغیرہ کے اعتبار سے ایک کو دوسرے پر کس قدر فضیلت دی ہے الخ

کیا فضلنا کے صیغے سے یہ ثابت ہو گیا کہ مذکورہ چیزوں میں فرقِ مراتب وہبی ہے

دوسری جگہ قرآن نے اِن تمام چیزوں کا تعلق اِنسان کی سعی اور اُس کے کسب سے قائم کر کے قانونِ الٰہی کو بالکل واضح کر دیا۔ فرمایا۔

لیس للانسان الا ما سعیٰ (سورہ والنجم) آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس نے کمایا ہے۔

دوسری جگہ اِسی عام قانون کو اِس طرح واضح فرمایا۔

ویؤت کل ذی فضل فضلہ (سورہ ہود) — اور ہر زیادتی والے کو اپنی زیادتی دیوے۔

مولٰینا لکھتے ہیں۔

جو جس قدر زیادہ بڑھ کر عمل کرے گا اُسی قدر خدا کے فضل سے زیادہ حصہ پائے گا۔

میں نے اُوپر عرض کیا۔ ہر عطاءِ الٰہی کو وہبی نہیں کہا جا سکتا ملاحظہ فرمائیے سورہ بنی اسرائیل کی مذکورہ آیت سے پہلے ارشاد فرمایا ہے

کلا نمد ھؤلاءِ و ھؤلاءِ من عطاءِ ربک وما کان عطاءُ ربک محظورًا ط — ہم ہر ایک کو پہنچائے جاتے ہیں اُن کو اور اُن کو تیرے رب کی بخشش میں سے اور تیرے رب کی بخشش کسی نے روک نہیں لی۔

یعنی مال و دولت کی ہر حیثیت، طاقت و قوت کا ہر درجہ عطاءِ الٰہی ہے، لیکن اِس کے باوجود "وہبی" نہیں ہے

حضرت سلیمان علیہ السلام کو دنیوی شان و شوکت، دولت و حشمت کا عظیم مرتبہ عنایت فرمایا اور پھر اِس خصوصیت کے ساتھ عطا فرمایا کہ اُسے بے حساب کر دیا۔

ھذا عطاءُنا فامنن او امسک بغیر حساب ۵ (سورہ ص) — یہ ہماری بخشش ہے اب تو احسان کر یا رکھ چھوڑ، کچھ حساب نہ ہوگا۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

"یہ اور مہربانی کی کہ اتنی دنیاوی اور مختار کر دیا حساب معاف کر کے، لیکن وہ کھاتے تھے اپنے ہاتھ کا، محنت کر کے ٹوکرے بناتے تھے۔"

یہ بھی عرض کر دوں کہ دنیوی ساز و سامان، شاہانہ کرّ و فر، ہواؤں اور جنات کی تسخیر، یہ وہ مرتبہ ہے جو گروہ انبیاء میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ مخصوص تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی درخواست بھی کی تھی لیکن آج تک کسی نے اس عطاء الٰہی کو وہبی نہیں کہا۔ البتہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی خصوصیت تھی۔

لھا اور علیھا کا فرق

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ علیھا اور لھا کے فرق کا کسبی اور وہبی کے مسئلہ سے کیا تعلق ہے اور اس بحث میں یہ دونوں آیات کس مقصد کے لئے لائی گئی ہیں۔

ان آیات سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے علیھا ما اکتسبت ـــ نہیں فرمایا گیا۔ عام لوگوں کے لئے فرمایا گیا ہے۔ تو اس کی وجہ ظاہر ہے کہ معصوم زندگیوں کے لئے علیھا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر مولانا نے غور نہیں فرمایا۔

تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم۔ (بقرہ)	وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی اُن کے واسطے ہے جو اُنھوں نے کیا اور تمھارے واسطے ہے جو تم نے کیا۔

اِس آیت کا تعلق صرف انبیاء علیہم السلام سے نہیں ہے اُمّتہ میں
حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد (اَسباط) بھی شامل ہے۔ اور
ظاہر ہے کہ اولادِ یعقوب میں صرف حضرت یوسف علیہ السلام نبی تھے، آپ
کے دوسرے بیٹے نبی نہیں تھے، مولٰنا ہی بتا سکتے ہیں کہ ان آیات سے کیا
ثابت کرنا مقصود ہے۔

مقامات پر سوال مقامات کے حاصل ہونے پر رسولوں سے سوال
ہونے یا نہونے کی بحث بھی اِس موقع پر بہت
عجیب ہے یہ کس نے کہا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہر رسول کے لیے ایک "خصوصی مرتبہ"
متعین فرمایا تھا اور اس مرتبہ تک ہر رسول کو پہنچنا ضروری قرار دے دیا گیا۔
مرتبۂ کمال کے کسبی ہونے کا تو یہ مطلب ہے کہ حضرتِ حق نے ہر رسول کو روحانی
ترقی کے وسیع میدان میں سعی و کسب کی آزادی کے ساتھ مامور کر دیا تھا۔ تاکہ
ہر رسول گروہ انبیاء میں اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبۂ فضیلت حاصل کرنے کے لئے
حُسنِ سعی کی زیادتی سے زیادہ پونجی جمع کر کے اپنے مولیٰ کے حضور میں لے جائے۔
راقم نے مذکورہ خیال جن آیات کے مطالعہ سے اخذ کیا ہے وہ آیات
مع تفسیر کے پیش کر دی گئی تھیں اور ہر آیت کے تحت مفسّرین کے اقوال درج
کر دیئے گئے تھے تعجب ہے کہ مولٰنا نے اُن حوالوں پر غور نہیں فرمایا۔
مولٰنا نے ان چاروں آیات پر جو کچھ فرمایا ہے اُس کا تجزیہ ملاحظہ فرمایئے

آیتِ اعتزال آیت اعتزال میں "اعطاء اسحٰق و یعقوب"
کو اعتزال پر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے

متفرع کیا ہے یہ جسارت احقر نے نہیں، مولٰنا نے مندرجہ ذیل عبارت پر غور نہیں فرمایا۔

۲ــــ اگر تفریع تسلیم کرلی جائے تو اعطاء اولاد کا نبوّت سے افضل ہونا کس قاعدے سے ثابت ہوتا ہے، بات بہت مجمل ہے، غیر واضح ہے نبوت سے افضل ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

۳ــــ اگر اعطاء اسحٰق کے ترتب کو صحیح مان لیا جائے تو جعلنا نبیًّا کے ترتب کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا اور اس سے نبوّت کا کسبی ہونا لازم آجائے گا، یہ اعتراض درست ہے، لیکن حافظ ابن کثیر رح نے ہمیں اس کا جواب دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں

جعلنا لہٗ نسلا و عقباً انبیاء اقرّ اللہ بھم عینہٗ فی حیاتہ ولھذا قال وکلا جعلنا نبیًّا"

مطلب یہ کہ حضرتِ یعقوبؑ کو حضرتِ ابراہیمؑ کی حیات میں نبی بنادیا اور اس سے ان کا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا۔

ترتب اس کا نہیں کہ اسحاق اور یعقوب کو نبی بنادیا، ترتّب اس کا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں دونوں کو نبی بنادیا گیا

نبوّت کا منصب تو ان دونوں بزرگوں کو عطا ہونا ہی تھا آگے یا پیچھے، کیوں کہ نبوّت خدا کے یہاں مقدّر ہو چکی تھی، لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی زندگی ہی میں عطا ہو، حضرت ابراہیمؑ کے اعتزال کی عظیم نیکی نے اُن کی زندگی ہی میں اُن کے بیٹے اور اُن کے

پوتے کو نبوّت کے منصب پر فائز کر دیا تا کہ خلیل اللہ کا دل ٹھنڈا ہو جائے
مولٰنا نے سورہ یوسف کی جس آیت کو پیش کر کے اِشکال وارد کیا ہے
وہاں نہ تفریع ہے نہ ترتب ہے پھر نہ جانے کس مناسبت سے وہ آیت پیش
کی گئی ہے، اسی طرح "واذ یرفع ابراھیم القواعد" کی آیت میں
بھی کوئی تفریع نہیں ہے، مولٰنا نے خواہ مخواہ اِس آیت کو بے جوڑ
پیش کر کے طوالت دیدی ہے۔

اِس کے علاوہ جب نبوّت کا وہبی ہونا مسلم ہے تو اگر اُس کا
ترتب بھی کسی آیت میں اتفاق سے نظر آجائے تو اس سے اِس بحث پر
کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، حالانکہ راقم نے بالاستیعاب قرآنِ کریم پر غور کیا
لیکن کوئی آیت ایسی نظر سے نہیں گزری جس میں اعطاءِ نبوّت کو حُسنِ عمل پر
متفرع کیا گیا ہو۔ نبوّت کے لئے تو اِجتبار، اصطفار کے الفاظ ہی اختیار
کئے گئے ہیں۔

آیتِ اِبتلار

آیت ابتلار میں اِعطار امامت کا اِبتلار پر ترتب
کیا گیا ہے، اِسی ترتب کا مفہوم حضرت شیخ الہند
رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ترجمہ میں لفظ "تب" لاکر ظاہر فرمایا ہے
مولٰینا زاہد صاحب نے اِس لفظ "تب" کو راقم کا تصرف قرار دیا،
مولٰنا کو ایسا سنگین الزام لگانے سے پہلے غور کر لینا چاہئے تھا کہ وہ کیا فرما
رہے ہیں۔ مولٰینا نے شاید یہ فرض کر لیا کہ پہلے میں نے ایک عقیدہ وضع کیا، پھر
اس کی تائید کے لئے قرآنِ کریم میں کھینچا تانی شروع کر دی۔ خدا تعالےٰ نے اِس

گمراہی سے محفوظ رکھے۔ آیات کے ترجمہ میں میں نے اکثر حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ اختیار کیا ہے کیونکہ میری رائے یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ اُردو زبان میں پہلا اور آخری ترجمہ ہے، زبان کی تبدیلی کے باعث اِس ترجمہ میں معمولی تغیر کی ضرورت تھی اُسے حضرت شیخ نے پورا کر دیا۔

البتہ ترجمہ کرتے وقت کہیں کہیں اتنی جسارت ضرور کرتا ہوں کہ ــــــــ

مبتدا و خبر، یا حال اور ذو الحال کی ترتیب موجودہ محاورہ کے مطابق ہو جائے لیکن الفاظ میں تغیر نہیں کرتا۔

یہ "تو تب" کے لفظ کا جواب ہوا۔

پھر میں عرض کروں گا کہ مولٰنا نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا وہ اثر ملاحظہ نہیں فرمایا جو میں نے ابن کثیر جلد اوّل صفحہ ۱۶۵ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے اور جس میں صاف طور پر جزاء علی ما فعل ــــ کے الفاظ موجود ہیں یعنی یہ اعطاء منصب امامت عامہ بدلا ہے اور صلہ ہے اس آزمائش میں پورا اُترنے کا۔ مولٰنا زاہد صاحب فرماتے ہیں۔

"یہ تعلق علت و معلول کا نہیں ہے بلکہ اسی طرح عطیات کی شکل میں ہے"۔

تو محترم۔ ! میں نے کب اِسے علّت و معلول کا تعلق کہا ہے۔ میں بھی تو اِسے عطیۂ الٰہی کہہ رہا ہوں، البتہ ایسا عطیہ نہیں جو نبوّت کی طرح وہبی ہو۔ بلکہ ایسا عطیہ جو سعی و کسب کے عام قانون کے تحت ہر بندہ کو مالک الملک کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔

آیت صبر "لما صبروا" میں راقم نے حین کے ظرفیت ہی کے معنیٰ کئے ہیں، شرط کا مفہوم نہ ذہن میں تھا نہ وہ ترجمہ میں اختیار کیا گیا ہے، لیکن پیش کردہ استدلال پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ "ظرفیت" کے معنیٰ میں بھی باقی رہتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اکابر بنی اسرائیل کو صبر و استقلال کے وقت منصب پیشوائی کیوں عطا ہوا اس سے قبل کیوں نہ عطا ہوا؟

وقت صبر اور حالت استقلال کا انتخاب ہی یہ بتا رہا ہے کہ اس سے قبل وہ منصب پیشوائی کے اہل نہ تھے، قوتِ برداشت کی تکمیل کے بعد ہی وہ عوامی رہنمائی کے قابل ہوئے۔

علاوہ اس کے لِمَا میں حمزہ اور کسائی کی بھی قرأت ہے اور وہ ہے لام کے کسرہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ اور اس صورت میں لام تعلیلیہ ہوگا مولانا کے سامنے یہ احتمال بھی رہنا چاہیئے۔

جمہور کی قرأت پر لما بمعنی حین تھی لیکن سببیت کا مفہوم اس سے بھی نکالا گیا ہے۔ اس آیت پر مولانا سلیمان ندوی رح کا یہ نوٹ ملاحظہ فرمایئے۔

—"آیتِ بالا نے بنی اسرائیل کی گذشتہ پیشوائی کے دو سبب بیان کئے ہیں۔ (۱) ایک احکام الٰہی پر یقین۔ اور دوسرے اِن احکام کی بجا آوری میں صبر و ثبات قدمی۔"

(سیرت النبی صہ ۶۴۲ جلد ۵)

مقامِ محمود! راقم اِس بحث میں نہیں گیا کہ مقامِ محمود کے لئے تہجد شرط تھی، عرض یہ کیا گیا تھا کہ آخر مقامِ محمود کا تعلق نمازِ تہجد کے ساتھ کیوں قائم کیا گیا۔ یہ وعدہ یقیناً پورا ہونا تھا، لیکن پھر حق تعالیٰ نے حکمِ تہجد کے بعد اس وعدہ کا کیوں اِعادہ فرمایا، قرآن کے اِس اُسلوب کی آخر کوئی حکمت موجود ہے یا نہیں ۔؟ بات تو صرف اتنی ہے اچھا! حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ نوٹ ملاحظہ فرمائیے۔

"نیند سے جاگ کر قرآن پڑھا کر یہ حکم سب سے زیادہ تجھ پر کیا ہے کہ تجھ کو مرتبہ بڑا دینا ہے۔"

حضور کو بڑا مرتبہ دینا مقصود تھا تو خصوصی احکام دینے کی ضرورت کیا تھی ۔؟ یہ خصوصی احکام خصوصی جد و جہد کے لئے تھے اور خصوصی جد و جہد اُس عظیم مرتبہ کا دیباچہ تھی جو آپؐ کو عطا کیا جانے والا تھا، یہ عظیم مرتبہ بحیثیت خاتم الانبیاء ہونے کے ـــــ آپؐ کو عطا کیا جانے والا تھا۔

حضورؐ کا اُسوۂ پاک
قرآنِ کریم کی عملی تشریح ہے

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ پاک قرآن کریم کی تعلیمات اور احکام کی تشریح اور وضاحت کے لئے مکمل نقشۂ عمل ہے جس طرح تمام آسمانی کتابوں میں قرآن کریم خدا تعالیٰ کی جامع کتاب ہے اسی طرح تمام رسولوں میں حضورؐ کا اسوۂ حسنہ جامع ترین اُسوہ ہے۔

قرآنِ کریم میں انسانی ہدایت و سعادت کے لئے سب کچھ موجود ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اصولی طور پر قرآن کریم کامل و مکمل اور جامع ہے۔ لیکن ہر انسان کی عقل اِس قابل نہیں کہ قرآنِ کریم سے براہ راست ہر معاملہ میں ہدایت حاصل کر سکے اِس مقصد کے لئے رسول اکرمؐ کا نقشۂ عمل اور اسوۂ حسنہ قران کریم کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا گیا۔

لقد کان لکم فی رسول اللہِ اسوۃ حسنۃ ؕ (ہر قوم کے لئے ان کے پیشوا نمونہ ہوتے ہیں) تمہارے لئے بہترین نمونہ خدا کا یہ رسول ہے۔ (سورہ احزاب)

قرآنِ کریم کی تشریح کے لئے جو سیرت و کردار حضورؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور جو سنت اپنی اُمت کو سکھائی وہ بھی خدا کی طرف سے جبریل امین

آپ کو سکھایا کرتے تھے۔

کان الوحی ینزل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ویحضرہ جبریل بالسنۃ التی تفسر ذالک۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی آیا کرتی تھی اور جبریل علیہ السلام آپ کے پاس (وحی) سنت لے کر آیا کرتے تھے جو اس کی تشریح کر دیتی تھی۔

ترجمان السنہ جلد اول ص ۲۳

اسی لئے حضور کی اطاعت کو واجب اور ضروری قرار دیا گیا ہے اور آپ کی اطاعت اسلام میں مستقل حیثیت رکھتی ہے۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ

ہم نے رسول اس لئے بھیجا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

حضور کا اسوۂ پاک

قرآن کی صداقت کی عملی شہادت ہے

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک جہاں قرآنِ پاک کی اصولی تعلیمات کی جامع تشریح ہے وہاں صداقت قرآن کی عملی دلیل بھی ہے۔

لیکون الرسول شہیداً علیکم وتکونوا شہداء علی الناس (حج)

تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم دوسرے لوگوں پر گواہ بنو۔

یہ گواہی عملی گواہی ہے، صرف زبانی گواہی نہیں، اسی عملی گواہی نے قرآن پاک

کی صداقت کو واضح کیا ہے اور دنیا کے لئے ناقابل انکار بنا دیا ہے۔
اسی عملی صداقت کی طرف حضور نے اپنے آپ کو "اول المسلمین" کہہ کر اشارہ کیا ہے یعنی حضور نے احکامِ الٰہی کی فرمانبرداری کر کے اپنے عمل سے قرآن کی صداقت کو نمایاں کیا۔
قرآن کریم نے حضور کو کئی جگہ شاھد اور شہید کہا ہے۔ سورہ نسار کی آیت ۔ ومن یطع اللہ والرسول ___ کے تحت امام رازی رح لکھتے ہیں۔

یہاں شہید سے کافروں کے ہاتھ سے مرجانے والا مراد نہیں لیا جا سکتا، کیونکہ آیت میں جس شہادت کا ذکر ہے وہ دین کا اعلیٰ مرتبہ ہے اور کافروں کے ہاتھ سے قتل تو بعض اوقات فاسق بھی ہو جاتے ہیں، نیز اللہ کے مومن بندے اس سے دعار کرتے ہیں کہ انھیں مرتبۂ شہادت نصیب کرے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے ہو سکتا کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ خدا اُن پر کافروں کو مسلط کر دے ان کے ہاتھ سے انھیں قتل کرائے، بلکہ شہید سے وہ حق پرست مراد لیا جائے گا جو اللہ تعالیٰ کے دین کی صداقت کی گواہی کبھی زبان سے دے اور کبھی دلیل سے و برہان سے اور کبھی شمشیر و سنان سے، اور اپنی عملی زندگی میں اُس کا قدم عدل و توسط سے کسی وقت اِدھر اُدھر نہ ہو۔

شہدار کی تشریح کرتے ہوئے صاحب قاموس القرآن

علامہ عبدہ المصری کا قول نقل کرتے ہیں

"شہدار، وہ جماعت ہے جس میں شامل ہونے کا ہمیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے "لتکونوا شہداء علی الناس یہ جماعت اُن اصحاب عدل وانصاف کی ہے جو اہل حق کی صداقت کی گواہی دے کر حق کی تائید کریں اور اہل باطل کے بطلان کو آشکارا کر کے اُن کے خلاف حجت قائم کریں، اُن کا درجہ صدیقین کے قریب قریب ہے۔

اس کے بعد علامہ رشید رضا مصری کا یہ قول نقل کیا ہے وہ شہادت جس کے ذریعہ اہل حق اہل باطل پر حجت قائم کرتے ہیں اقوال سے بھی ہوتی ہے، اعمال سے بھی، اخلاق سے بھی ہوتی ہے، احوال سے بھی۔ لہذا شہدا اپنی سیرت کی عمدگی کی بنا پر اہل باطل پر دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی حجت ہوتے ہیں

بحوالہ تفسیر المنار ج ۵ ص ۲۴۳)

اسی معنی میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم "شہید" ہیں اور تمام شہیدوں کے سردار ہیں۔

آپ کی سیرت پاک اور اسوہ حسنہ نے صداقت قرآن پر حجت قائم کی۔ اسلام کی سچائی کو آشکارا کیا، دینِ حق کا احقاق فرما کر کفر و شرک کے بطلان کو تمام عقل سلیم والوں کے لئے ناقابل انکار بنا دیا۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم

مومنِ اوّل ——— مومنِ کامل

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی اور بنیادی صفت — "مومن کامل" ہے۔ اس صفتِ پاک کا حضرت حق تعالیٰ نے اپنے رسول سے قرآنِ کریم میں اعلان کرایا۔ سورۂ انعام کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا۔

وبذالک امرت وَ انا اوّل المسلمین — اور یہی حکم مجھ کو ہوا اور میں سب سے پہلے فرمانبردار ہوں۔

حضور کی اِس صفت کے تین مطلب ہو سکتے ہیں۔

۱— میں اپنی اُمت میں اور اپنے دَور میں پہلا مومن ہوں، سب سے پہلے میں اپنے خدا پر ایمان لایا، پھر خدا کا پیغام دنیا والوں کے سامنے پیش کیا۔ عام مفسرین نے اِس کے یہی معنی ے ہیں۔

مولٰنا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں عام مفسرین کی تفسیر کے مطابق یہی معنی اختیار کیے ہیں فرماتے ہیں

"۔ اور میں اِس دین والوں میں ——— سب ماننے والوں سے پہلا ماننے والا ہوں۔"

۲— دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ میں تمام نوعِ انسانی میں سب سے پہلا مومن ہوں، جامع ترمذی کی ایک مشہور روایت ہے۔ حضور نے ارشاد فرمایا۔

کنت نبیا و آدم بین الروح والجسد

یعنی میں اُس وقت نبی تھا جب آدم روح اور جسم کے درمیان تھے۔ اِس حدیث کے لحاظ سے حضور اوّل الانبیا ہیں۔ پہلے نبی ہیں۔

پس جب آپ پہلے نبی ہیں تو پہلے مومن ہونے میں کیا شُبہ ہوسکتا ہے اِسی لئے بعض مفسرین نے "اول المسلمین" کے معنیٰ یہی کئے ہیں کہ حضور تمام کائناتِ انسانی میں سب سے پہلے "مومن" ہیں

۳۔ تیسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے ———— کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان ویقین کا درجہ سب سے اوّل و اعلیٰ ہے۔

خدائے برحق نے آپ کو ایمان وتسلیم کا وہ مقام عطا کیا ہے جس میں کوئی دوسرا آپ کے برابر نہیں۔

مولٰنا شبیر احمد عثمانی رح نے اپنے تفسیری حاشیے میں اِسی تقدم رتبی" کو بیان کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے اوّل المسلمین کے ترجمہ میں "پہلا فرمانبردار ہوں" کی جگہ "———— پہلے فرمانبرداروں ———— کہہ کر اِسی طرف اِشارہ کیا ہے، کیونکہ محاورات کے اعتبار سے یہ تعبیر اولیت رتبی کے ادا کرنے میں زیادہ واضح ہے۔

راقم نے اِسی مطلب کے لحاظ سے اس باب کا عنوان "مومن کامل" قرار دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہر اعتبار سے مومنِ اوّل ہیں، آپ اپنے دَور میں بھی اوّل مومن ہیں، تمام نوعِ انسانی میں بھی پہلے مومن ہیں اور درجہ کے لحاظ سے بھی آپ کا ایمان کمال کے سب سے

اونچے مقام پر فائز ہے۔

ہمارے اکابر میں حضرت مولٰنا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو "آفتاب نبوت" قرار دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ دُنیا میں ہر مومن کا ایمان دراصل اس ایمانی نور اعظم کی شعاع ہے جو آفتاب نبوّت سے پھیلتی ہے جس قلب انسانی پر اس آفتاب نبوّت کی شعاع پڑجاتی ہے وہی ایمان و یقین کی روشنی سے جگمگا اُٹھتا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس موقع پر حضرت نانوتوی کے علوم و نظریات کے بہترین شارح حضرت مولنا عثمانی رح کا ایک تشریحی نوٹ نقل کر دیا جائے۔ جو حضرت مولٰنا نے سورۂ احزاب کی حسب ذیل آیت پر لکھا ہے۔

النّبیّ اولیٰ بالمومنین	نبی سے لگاؤ ہے ایمان والوں کو زیادہ
من انفسھم وازواجہ امھاتھم	اپنی جان سے اور اس کی عورتیں اُنکی مائیں ہیں

مولٰنا حاشیہ پر فرماتے ہیں ——— اُمتی کا ایمان و روحانی وجود نبی کی روحانیت کبریٰ کا ایک پرتو اور ظل ہوتا ہے اور جو شفقت اور تربیت نبی کی طرف سے ظہور پذیر ہوتی ہے ماں باپ تو کیا تمام مخلوق میں اس کا نمونہ نہیں مل سکتا، مومن اگر اپنی حقیقت سمجھنے کے لئے حرکت فکری شروع کرے تو اپنی ایمانی ہستی سے پیشتر اس کو پیغمبر علیہ السلام کی معرفت حاصل کرنی پڑے گی۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب "آب حیات" میں اس حقیقت کی پوری وضاحت کی ہے۔

ایمان بالتوحید اور سیرتِ پاک

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اوپر بتایا گیا کہ آپ خدا کے تمام بندوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان ویقین رکھتے تھے۔ اب تفصیل کے ساتھ یہ بتایا جائے گا کہ آپ کی سیرتِ پاک ایمان ویقین کی تمام حقیقتوں کے لئے کتنی عظیم شہادت اور کتنا اعلیٰ نمونہ ہے۔

سب سے پہلے "توحید الٰہی پر ایمان" اور سیرتِ پاک کی عملی شہادت کو لیجئے۔

خدا تعالیٰ کی برتر وبالا ذات کمال، قدرت، علم واختیار کی تمام اعلیٰ صفتوں کے ساتھ موجود ہے اور اپنی شان میں یکتا وتنہا ہے۔

یوں تو آپ کی زندگی اور کردار توحید الٰہی کے ایک ایک گوشہ کے لئے کھلی دلیل اور واضح شہادت ہے لیکن یہاں صرف چند گوشوں کی وضاحت کی جاتی ہے۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا "عظمت وکبریائی صرف خدائے واحد کے لئے ہے، کوئی بڑے سے بڑا انسان، دیوی، دیوتا، چاند، سورج اور مخلوق کی کوئی ہستی اس صفت میں خدا کے ساتھ شریک نہیں۔

سارا عالم اس کی عظمت کے سامنے عاجز ہے، بے اختیار ہے

ولہ الکبریاء فی السمٰوات والارض ۔ آسمان وزمین میں بڑائی صرف اُسی کے لئے ہے۔

وقت کی عجیب و غریب پکار

توحیدِ حق

توحیدِ حق کی یہ آواز اپنے وقت کی بالکل عجیب و غریب پکار ثابت ہوئی
انسانی آبادی کے ہر گوشہ میں مشرق سے لے کر مغرب تک، شرک اور مخلوق
پرستی کا دَور دَورہ ہے، کہیں چاند سورج اور ستاروں کی عظمت کے گیت
گائے جا رہے ہیں، کہیں خدا کے معصوم رسولوں عُزیر و مسیح علیہم السلام کو
خدا کا بیٹا کہہ کر خدا کی عظمت میں شریک و سہیم بنایا جا رہا ہے۔ اور یہ سب کچھ
اپنی طرف سے نہیں خدا کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ یہ کہہ کر کیا جا رہا ہے کہ خدا نے
ہمیں تعلیم دی ہے کہ میری یہ مخلوق میری عظمت میں شریک ہے، اس کو
پوجو، اسکی پرستش کرو۔

وقال الذین اشرکوا لوشاء الله ما اشرکنا ولا اٰباؤنا من دونه من شیئٍ

یہ مشرک لوگ کہہ رہے ہیں اگر خدا نہ چاہتا تو ہم کبھی ان چیزوں کو اس کے ساتھ شریک نہ کرتے نہ ہمارے باپ دادا۔

شرک و مخلوق پرستی میں گھری ہوئی یہ دُنیا جب رسول پاک صلی اللہ علیہ
وسلم کی زبان پاک سے توحید الٰہی کی پکار سنتی ہے تو اسے ایک عجیب بات
سمجھتی ہے اور تعجب سے کہتی ہے۔

اجعل الاٰلِهة اِلٰهًا واحدًا

کیا اس نے سب خداؤں کے بدلے ایک خدا

ان ھذا لشیئ عجاب ط — یہ بڑے تعجب کی بات ہے

(سورہ ص)

پھر یہ قوم زبان سے توحیدِ حق کی پکار کو ——— صرف عجیب وغریب کہنے پر ہی اکتفا نہیں کرتی بلکہ مذہبِ شرک کی حفاظت کے لئے ظلم و تشدد پر اُتر آتی ہے لیکن یہ قوم جب توحید الٰہی کی عقل سلیم کو اپیل کرنے والی تعلیم کے ساتھ ساتھ توحید کے رنگ میں ڈوبی ہوئی داعی توحید کی عملی زندگی کو بار بار دیکھتی ہے تو اُس پتھر سے زیادہ سخت قوم کا کفر ٹوٹے بغیر نہیں رہتا۔

اِس قوم کو رسول پاک کی زندگی میں توحیدِ حق کا رنگ ہر پہلو سے نظر آیا اور ایک پہلو تو اِس قوم کے دل و دماغ پر ایسا چھایا کہ وہ اس کا اثر قبول کئے بغیر رہ ہی نہ سکی، یہ اثر آپ کی عبدیت، تواضع، خاکسارانہ مزاج کا تھا ـــ تفصیل سے عرض کرتا ہوں، غور کیجئے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے سب سے بڑے خاندان کے چشم و چراغ ہیں خاندان ہاشم کے شاہزادے ہیں، آپ کے بزرگوں کو عرب میں دیوتاؤں کی حیثیت حاصل ہے، خاندانی عظمت کے ساتھ ساتھ آپ کی ہونہار جوانی، جوانی میں ہوشمندی اور امانت کی خوبیاں آپ کو قوم کی آنکھ کا تارا بنا دیتی ہے۔ چالیس سال تک (اعلانِ توحید سے پہلے پہلے) پوری قوم آپ کو سر پر اُٹھائے پھرتی ہے اِکتالیس ویں سال جب آپ کی زبان سے شرک کے خلاف آواز اُٹھتی ہے تو ہر قسم کی پیش کش کرتی ہے، دولت کی، سرداری کے منصب کی، خوبصورت عورت کی ——— لیکن رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ورثہ میں ملنے والی

عظمت وبزرگی کو، قوم کی ہر پیش کش کو توحید حق کی خاطر ٹھکرا دیتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں۔

انا عبدہٗ و رسولہٗ — میں تو اُس کا بندہ اور رسول ہوں

سرداری اور آقائیت کو چھوڑ کر بندگی پر ناز کرتے ہیں، دیوتا اور معبود بننے کے بجائے دربارِ وحدانیت کی سفارت و رسالت کے منصب پر فخر کرتے ہیں، قوم حیران ہو کر دیکھتی ہے اور دل میں کہتی ہے کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیوتاؤں جیسی عظمت دینا چاہتے ہیں اور یہ بندگی کا اعلان کرتا ہے، خدائے واحد کی غلامی پر ناز کرتا ہے۔

خدا کے پہلے رسولوں نے اچھے سے اچھے لقب پائے، حضرتِ ابراہیمؑ خلیل اللہ کہلائے، حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ بنے، حضرت عیسیٰؑ کو روح اللہ کہا گیا، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام رسولوں سے افضل ہیں، آپ بھی اچھے سے اچھا لقب اختیار کر سکتے تھے لیکن آپ نے جو لقب اختیار کیا وہ بندگی اور غلامی کے وصف میں ڈوبا ہوا ہے۔

نبی عبد — امام رازی نے اپنی تفسیر "تفسیر کبیر جلد ۶ صفحہ ۴۵۲ (عن الضحاک) میں لکھا ہے کہ جب دشمنانِ اسلام نے حضور کو فقر و فاقہ کا طعنہ دیا تو آپ اس طعنہ سے قدرے رنجیدہ ہوئے۔ اس پر جبریل امین، رضوان جنت کے ساتھ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا۔ ان ربک یخیرک بین ان تکون نبیاً ملکاً وبین ان تکون نبیاً عبداً فقال علیہ السلام بل نبیاً عبداً

یعنی خدا تعالیٰ نے آپ کو بادشاہت اور عبدیت کے درمیان اختیار دیا ہے حضور نے فرمایا "مجھے عبدیت پسند ہے"

پھر بندگی کے اس لقب نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام زندگی کو اخلاق و عادات کو، رہن سہن کو اور پوری معاشرت کو ایسا متاثر کیا کہ آپ کی تمام زندگی عبدیت کی تفسیر بن کر رہ گئی۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عبدیت کو دیکھ کر آپ کی قوم سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اگر محمد بن عبداللہ خدا کی بندگی پر ناز کر رہے ہیں تو پھر ربّ محمدؐ کے سوا کبریائی کس کو زیب دے سکتی ہے ——؟ اگر محمدؐ کا سر خدا کے در پر جھکنے میں عزت محسوس کرتا ہے تو ربّ محمدؐ کے سوا کونسا در ایسا ہو سکتا ہے جہاں مخلوق اپنا سر جھکائے۔

قوم کے دل و دماغ میں یہ حقیقت اترتی چلی گئی کہ جس آستانۂ احدیت کے سامنے محمد رسول اللہ ایک بندہ اور رسول سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے وہاں لات، عزیٰ اور ہبل جیسے بے جان دیوتاؤں کی کیا حقیقت ہے۔

بس اس ایک ہی ضرب نے ان کے دلوں سے مخلوق کی عظمت کے بتوں کو چکنا چور کر کے رکھ دیا۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عبدیت نے دنیا کو بڑے بڑے نظارے کرائے، آپ کی بندگی کے ہر مظاہرے نے کبریائی حق پر کھلی شہادت پیش کی۔

غلاموں سے نفرت کرنے والی قوم کے اس فرد جلیل نے غلاموں کو

اپنے سینے سے لگایا، شاہوں کی گود میں پلنے والے اس مردِ حق نے غلاموں کی طرح بیٹھ کر کھانا کھایا غلاموں کی طرح اونچا لباس پہنا۔

اور ہمیشہ یہ دعا فرمائی۔

اللّٰھم احینی فی المساکین وامتنی فی المساکین واحشرنی فی المساکین۔	خداوندا۔! مجھے اپنے مسکین بندوں میں زندہ رکھیو، انہی کے ساتھ موت دیجیو اور انہی کے ساتھ قیامت میں میرا حشر کیجیو۔

خاتم الانبیاء اور محبوب رب العالمین ہونے کی حیثیت سے آپ کا درجہ تمام رسولوں میں سب سے بڑا ہے لیکن بڑائی کے اس عقیدے کو حضور نے کبھی حد اعتدال سے بڑھنے نہیں دیا کیونکہ وہ آپ کی صفت عبدیت کے لیے ناگوار خاطر تھا۔

ایک دفعہ بنو عامر کے قبیلے کا ایک وفد حضور کی خدمت میں حاضر ہوا حضور مسجد میں تشریف فرما تھے، چہرۂ انور پر نبوت کے جمال روشن تھے عجیب شان برس رہی تھی، ارکانِ وفد کی آپ کے باوقار چہرہ پر نظر پڑی، جوشِ عقیدت میں بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا۔۔۔ "حضور آپ ہمارے سید ہیں" آپ نے فوراً انھیں جواب دیا "نہیں"۔۔ سید تو خدا ہے۔

وفد کے ارکان بولے، آپ ہم سے افضل و برتر ہیں۔ آپ نے فرمایا "ہاں" یہ بات ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن خبردار! احتیاط کی سخت ضرورت ہے کہیں تمہیں شیطان بہکا کر نہ لے جائے۔ (سیرۃ النبی جلد ۲ بحوالہ مسند احمد جلد ۳)

ایمان و توحید کی بحث میں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے نقل کیا ہے۔

سیّد کے معنیٰ سردار کے ہیں، کہنے والوں نے اسی معنے میں آپ کو سیّد کہا ہے، بلاشبہ آپ سردار ہیں، لیکن اس موقع پر آپ نے اس لفظ کے استعمال سے اُس وفد کو اس لئے روکا کہ وہ نئے نئے لوگ تھے، حضور کے مزاج سے واقف نہ تھے آپ نے اُنھیں تنبیہ فرما کر احتیاط پسند بننے کی تلقین کی، جوش عقیدت کے فتنوں سے آگاہ کیا اور بتایا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی مشن توحید حق کی اشاعت ہے، شرک کے پھیلے ہوئے تمام فتنوں کو ختم کرنا ہے، آپ کے ساتھ محبت کرنے والوں کو اس حقیقت کا ہر وقت خیال رکھنا چاہیئے کہ دنیا میں اُن کے کسی طرز عمل اور کسی تصور و عقیدے سے شرک کا کوئی فتنہ کھڑا نہ ہو جائے۔

آخری شریعت میں مجاز اور استعارات

پہلی آسمانی کتابوں میں توحید و رسالت جیسے بنیادی مسائل کے لئے بھی مجاز اور استعارات کی زبان استعمال کی گئی ہے اور یہ اُن قوموں کے ذہنی حالات کی وجہ سے ضروری بھی تھا، لیکن ان قوموں کے گمراہ افراد نے مجاز اور استعارے کو حقیقت کا رنگ دے کر عوام کو گمراہی میں مبتلا کر دیا۔

خدا کی آخری شریعت نے اِس معاملہ میں بہت احتیاط سے کام لیا۔۔۔ قرآن کریم اور احادیث کی زبان میں مجاز و استعارات کا استعمال اسی وجہ سے برائے نام ملتا ہے۔

توحید و رسالت اور دوسرے اہم مسائل کو دین آخری نے نہایت صاف اور سادہ الفاظ میں بیان کیا ہے تاکہ عوام غلط فہمیوں کا شکار نہ ہوں۔ شریعت حقہ کی اِس احتیاط کو علماء نے تو ہمیشہ ملحوظ رکھا لیکن واعظوں کے ایک طبقہ نے اسے نظر انداز کر دیا جس کی وجہ سے خدا کی توحید اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت وصفات کے معاملہ میں ایک طبقہ حقیقت سے دُور ہو کر مجاز و استعارات کی بھول بھلیوں میں بھٹک گیا۔

آج اُمت میں حضور کے نوری اور بشری ہونے، علم غیب جاننے، استمداد من غیر اللہ، اور حاضر و ناظر جیسے مسائل قرآن کریم اور حدیث پاک کے صاف اور سادے بیانات کو چھوڑ کر تاویلات کی طرف بھاگنے کی وجہ سے زندہ ہیں اِس معاملہ میں حضور بڑے احتیاط پسند تھے اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

ایک دفعہ مدینہ منورہ میں قحط پڑ گیا، بارش رُک گئی، لوگوں نے حاضر ہو کر فریاد کی جمعہ کی نماز کا وقت تھا، حضور ممبر پر تشریف لائے اور اِس طرح خطبہ شروع کیا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْغَنِيُّ وَنَحْنُ الْفُقَرَاءُ اَنْزِلْ عَلَيْنَا الْغَيْثَ وَاجْعَلْ مَا اَنْزَلْتَ لَنَا قُوَّةً وَ بَلَاغًا اِلٰى خَيْرٍ

مطلب یہ کہ تمام تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جو سارے عالم کو پالنے پوسنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے، انصاف کے دن کا مالک ہے اُس کے سوا کوئی حاکم و معبود نہیں، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

اے اللہ۔! تو ہی صاحبِ اختیار معبود ہے، تیرے سوا کوئی اِس قابل نہیں جس کی بندگی کی جائے، تو غنی ہے، ہم محتاج ہیں، ہم پر باران رحمت نازل فرمادے اور اس سے ہمارے لئے غذا پیدا کردے اور الٰہی جو کچھ ہو خیر کے ساتھ ہو۔

اِس خطبہ کے بعد جمعہ کی دو رکعتیں ادا کیں، نماز پڑھ کر لوگ فارغ ہی ہوئے تھے کہ ۔۔۔ فَاَنشَاءَ اللّٰہُ سَحَابَۃً فرعدت وبرقت ثم امطرت ۔۔۔ دھواں دھار بارش شروع ہوگئی، نمازی سایہ تلاش کرنے لگے۔ حضور صحابہ کرام کی گھبراہٹ کو دیکھ کر مسکرادیئے۔

ـــــــ ضَحِکَ رسولُ اللّٰہِ حتّٰی بدات نواجذہٗ ـــــــ

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یا تو پانی، پانی کررہے تھے یا اب پانی سے چھُپ چھُپ کر بھاگنا شروع ہوگئے، اس کے بعد آپ نے فرمایا

اَشْھد اَنَّ اللّٰہ علی کل شیئٍ قدیر وَ اِنی عبد اللّٰہ و رسولہٗ

مطلب ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ ہر قسم کی قدرت خدا تعالیٰ ہی پاس ہے اور میں تو اس کا بندہ اور رسول ہوں۔

اِس موقع پر بندگی کا اعلان اِس اہتمام کے ساتھ کیوں کیا گیا ۔؟

ظاہر ہے کہ آپ کی دُعا نے کھُلی کرامت دکھائی، دُعا سے پہلے آسمان

صاف تھا، چند منٹ میں ابر چھا گیا، سارا مدینہ جل تھل ہوگیا۔
رسولِ پاک کی کرامتِ دُعا دیکھ کر ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص کسی غلط خیال میں مبتلا ہو جاتا، حضور کو بارش برسانے اور قحط دُور کرنے کے اختیارات کا مالک سمجھنے لگتا، اِس لیئے آپ نے صفائی کے ساتھ فرمایا۔

"میں تو صرف ایک بندہ ہوں، حاکمیت اور آقائیت صرف خدا ہی کو زیب دیتی ہے، اُس نے مجھے رسالت کا منصب عطا کیا، وہ میرے اس منصب کی لاج رکھتا ہے جب میں اُس کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہوں وہ میری دُعا قبول فرمالیتا ہے"

(ابو داؤد جلد اول صـ۱۶۶)

رسولِ پاکؐ نے سجدہ سے منع فرمایا

بعض صحابۂ کرام جب عرب سے باہر کی دنیا میں گئے تو انھوں نے دیکھا کہ لوگ بادشاہوں کے سامنے سر جھکا کر ان کی تعظیم کر رہے ہیں، معمولی معمولی سرداروں کے سامنے سجدہ کر کے نیازمندی کا اظہار کر رہے ہیں، عجمیوں کے اس طریقہ کو دیکھ کر صحابۂ کرام کو بھی خیال پیدا ہوا۔ سفر سے واپس ہو کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے، ادب سے گزارش کی۔

حضور۔! ہم نے عجم میں دیکھا، لوگ بادشاہوں کے سامنے سر جھکا کر تعظیم بجا لا رہے ہیں ---، اگر حضور اجازت دیں تو ہم بھی آپؐ کو سجدہ کیا کریں؟ "آپ تو دین کے سردار ہیں۔

رسولِ پاک نے خادموں کی عقیدت بھری درخواست سنی چہرۂ انور ایک دم غصہ میں انار کی طرح سُرخ ہوگیا، پوچھا۔ کیا تم میری وفات کے بعد میری قبر کو سجدہ کیا کرو گے ——— ؟ صحابۂ کرام نے عرض کیا "نہیں" حضور۔! ہم تو صرف زندگی میں سجدہ کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔ فرمایا۔ بس تو زندگی میں بھی اجازت نہیں دی جا سکتی، اسلام میں اگر مخلوق کو سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے۔[1]

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح

حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے کس قسم کے سجدہ کی اجازت مانگی۔؟

سجدۂ تعظیم کی یا سجدۂ عبادت کی ——————؟

سجدۂ عبادت کے متعلق تو صحابۂ کرام سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ وہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی کے لئے جائز ہو سکتا ہے، اِس لئے انھوں نے جس سجدہ کی اجازت مانگی وہ سجدۂ تعظیم تھا، اور یہی سجدہ تعظیم انھوں نے عجم میں رائج دیکھا، اور حضور نے جس سجدہ سے روکا وہ بھی یہی سجدۂ تعظیم تھا۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس طرزِ عمل نے اُمّت میں خودداری اور عزّتِ نفس کی روح پھونک دی وہ سمجھ گئے اگر دونوں جہان کے سردار کے سامنے تعظیم کے لئے سر جھکانا دسجدہ کرنا، روا نہیں ہے تو پھر خدا کے سِوا کوئی بڑا چھوٹا، اِس قابل نہیں جس کے سامنے سجدہ کرنا درست ہو، خدا کے بعد مسجود بننے کا حق اگر ہو سکتا تھا تو صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو سکتا تھا، جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی سجدہ کو اپنے لئے ناجائز قرار دیدیں تو پھر کون اس کا مستحق ہو سکتا ہے سوائے پروردگارِ عالم کے۔

کتنی بدنصیب ہے وہ پیشانی جسے سرورِ کونین عزّت بخشیں اور وہ دربدر جھکتی پھرے اور محبوبِ خدا کی دی ہوئی عزّت کو خاک میں ملائے۔

غزوۂ اُحد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوئے

صحابۂ کرام کی ذرا سی غلطی سے جنگِ احد کا نقشہ پلٹ گیا، دشمنوں کے ہاتھ سے بڑے بڑے صحابہ کرام نشتر کے قریب شہید ہو گئے ہیں،

خودِ رسول برحق کی آنکھ میں زخم آگیا ہے، بدنِ مبارک لہولہان ہے، سامنے کے چار دانتوں میں سے نیچے کا دایاں دانت شہید ہوگیا ہے، خود کی کڑیاں ٹوٹ کر رخسار مبارک میں گھس گئی ہیں، پیشانی بھی زخمی ہے، تکلیف کی شدّت سے قدم مبارک بھی لڑکھڑا گئے ہیں اور رسولِ پاک بیہوش ہوکر زمین پر گر پڑے ہیں کفّار نے شور مچا دیا ہے "محمد قتل کر دیئے گئے"

یہ کون، خون میں تر بتر ہے ۔۔۔؟ یہ خدا کے محبوب ہیں، یہ خدا کے ہیں، خدا ان کا ہے ۔۔۔ خدائی ان کی ہے، آج ان کو دشمن دیکھ کر کہہ رہے ہیں وہ خدا کی حفاظت کہاں گئی، وہ جبریل کہاں گیا، وہ وحی کہاں گئی، کیا محمدؐ کو اس کے خدا نے چھوڑ دیا، کیا رسول بھی اتنے لاچار ہوتے ہیں ـــــــ اس قسم کے طعنے دینے سے دشمنوں کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں سے رسولِ پاک کی عظمت نکل جائے، لوگ آپ سے بدظن ہو جائیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں کے یہ سارے طعنے سنتے ہیں، گھبراتے نہیں، ڈرتے نہیں، بڑی جرأت کے ساتھ اعلان فرماتے ہیں

قل لا املک لنفسی نفعًا ولا ضرًا الا ما شاء اللہ (اعراف)

آپ کہہ دیجئے! لوگو۔! میں اپنی جان کو نہ فائدہ پہنچانے کا اختیار رکھتا ہوں، نہ اُسے نقصان سے بچانے کا مگر جو خدا تعالیٰ چاہے۔

نبی برحق کے سوا کوئی دوسرا ہوتا تو گھبرا جاتا، طرح طرح کی باتیں بنا کر لوگوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرتا، اس کو یہ خطرہ لاحق ہو جاتا کہ

میرے معتقدین میں میری بات خراب ہو جائے گی مگر آپ نبی برحق تھے، صاف صاف اعلان کر دیا، میں ایک بے اختیار بندہ ہوں، میں نے کب دعویٰ کیا تھا۔ کہ میں خدا ہوں اور خدا کی طرح سیاہ وسفید کا مالک ہوں، آپ کے اس اعلان نے آپ کی سچائی کو بالکل روشن کر دیا، بے اختیاری کا اعلان آپ کی نبوّت کی دلیل بن گیا، لوگوں کے دِل میں خدا کی عظمت بیٹھ گئی اور یہ یقین پیدا ہو گیا کہ اگر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عظیم و بزرگ ہستی نفع ونقصان کا اختیار نہیں رکھتی تو پھر کوئی چھوٹا بڑا مالک و مختار نہیں ہو سکتا سوائے خدا کے، مُصطفےٰ کے آگے کیا حقیقت ہے چاند تاروں کی یا دیوی دیوتاؤں کی،

صفت رحم وکرم میں توحید اور سیرت پاک

خالق کی صفاتِ رحم وکرم میں بھی شرک عام ہے، دنیا اس گمراہی میں گرفتار ہے کہ خالق کے علاوہ مخلوق میں بھی کچھ برگزیدہ ہستیاں ایسی ہیں جن کے ہاتھ میں رحم وکرم کے مکمل اختیارات ہیں،۔

اِس مشرکانہ خیال کا نتیجہ ہے کہ لوگ مخلوق کی خوشی کے پیچھے خالق سے غافل ہو کر بیٹھ گئے ہیں حالانکہ مخلوق کی مہربانی اس وقت تک بے کار ہے جب تک خالق مہربان نہو یہ بھی حقیقت اور مجاز کا فرق ہے، رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی حقیقی رحمت اور مخلوق کی مجازی رحمت کے درمیان بڑی حکمت سے فرق واضح فرمایا۔

رحمت للعالمین حضرت

مسئلۂ شفاعت اور توحید الٰہی

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے شفاعت کے نازک مسئلہ میں رحمتِ ذاتی اور رحمت عطائی کے فرق کو کتنے موثر انداز سے واضح فرمایا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

حمد وثنا کے بعد جب خدا تعالیٰ سے شفاعت کی اجازت طلب کروں گا اور یہ عرض کروں گا۔

یا رب ائذن لی فیمن قال لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ (مسلم)

خداوندا! کلمۂ توحید کا اقرار کرنے والوں کے حق میں مجھے شفاعت کی اجازت دیجئے۔

تو اسی کے جواب میں حق تعالیٰ ارشاد فرمائے گا۔

قال لیس ذاک لک ولکن عزتی وکبریائی وعظمتی وجبریائی لاخرجن من قال لا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہُ۔

اہل توحید کی نجات آپ کی شفاعت سے نہیں بلکہ اپنی عزت، کبریائی، عظمت اور جبروت سے میں انہیں دوزخ سے نجات دوں گا۔

مُحدثین نے اس پر لکھا ہے کہ حق تعالیٰ کا مطلب یہ ہے کہ توحید پرستوں کے دل میں میری عظمت وکبریائی موجود ہے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ جس دل میں میرے نام کی عظمت ہو میں اُسے دوزخ کی آگ میں ڈالوں، مجھ پر حق ہے کہ میں اس پر کرم کروں، اُن کے لئے آپ کی شفاعت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ (فتح الملہم باب الشفاعۃ جلد ۱ ص ۳۶۶)

اس سے زیادہ واضح فرق اور ملاحظہ کیجئے۔ ارشاد فرمایا۔

میں شفاعت کی اجازت حاصل کرنے کے لیے سجدہ میں گر جاؤں گا اور جب تک اللہ چاہے وہ مجھے سجدہ میں پڑا رکھے گا، پھر آواز آئے گی۔

يَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَأْسَكَ قُلْ تُسْمَعْ ، سَلْ تُعْطَهْ اِشْفَعْ تُشَفَّعْ فَارْفَعُ رَأْسِي فَاَحْمَدُ رَبِّي بِتَحْمِيدٍ يُعَلِّمُنِيهِ رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ ثُمَّ اَشْفَعُ فَيَحُدُّ لِي حَدًّا فَاُخْرِجُهُمْ مِنَ النَّارِ وَاُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ

اے محمد! سجدہ سے سر اٹھاؤ، کہو! سنا جائے گا، مانگو! دیا جائے گا، شفاعت قبول کی جائے گی۔ پس میں سر اٹھاؤں گا، پھر خدا کی وہ حمد بیان کروں گا جو خدا مجھے سکھائے گا، پھر شفاعت کروں گا اور خدا تعالیٰ میرے لئے ایک حد مقرر کرے گا، پھر میں اسی حد و مقدار کے مطابق، گنہگاروں کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کروں گا۔

(مسلم)

حدیث میں تین دفعہ شفاعت کا ذکر آیا اور تینوں دفعہ یہ جملہ موجود ہے، فَيَحُدُّ لِي حَدًّا یعنی میرے لئے جہنم سے نکالنے کی ایک حد مقرر کر دی جائے گی

اب اس حدیث پر غور کیجئے۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

يَدْخُلُ مِنْ اُمَّتِي الْجَنَّةَ سبعون الفًا بغير حساب

میری اُمت میں سے ستّر ہزار افراد بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے

(رواہ مسلم عن ابی هریرة رض)

ابن کثیر نے اسی روایت کو عبد الرحمٰن بن ابی بکر سے اس طرح نقل کیا ہے۔

کہ جب حضور نے فرمایا، خدا تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا کہ میں تیری اُمّت میں سے ستّر ہزار افراد کو بغیر حساب جنت میں داخل کروں گا۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا۔ یارسول اللہِ فھلا استزدتہ

حضور آپ نے اس سے زیادہ کے لئے کیوں دُعا نہ فرمائی۔

ارشاد فرمایا۔ "میں نے دُعا کی تھی، خدا تعالیٰ نے ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار کا اور وعدہ فرمایا۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے تین بار کہا تیسری بار حضور نے فرمایا، میں نے اُمت کی مغفرت کے لئے اور زیادہ کی دُعا، کی تو حق تعالیٰ نے فاعطانی ھٰکذا مجھے اس طرح عطا فرمایا۔

راوی حدیث حضرتِ عبدالرحمٰن نے دونوں ہاتھ پھیلا کر لپ بنائی اور بتایا کہ حضور کا مقصد یہ تھا کہ خدا تعالیٰ لپ بھر کر میری اُمّت کو جنت میں داخل کرے گا۔

دوسرے راوی ہاشم کہتے ہیں کہ یہ لپ خدا تعالیٰ کی ہوگی،۔ کون؟ جان سکتا ہے کہ خدا کے لپ میں کتنوں کی نجات ہوگی۔ (بحوالہ مسند احمد)

غور کیجئے

حضور جب اپنی شفاعت کا ذکر فرماتے ہیں تو کہتے ہیں۔ میرے لئے شفاعت کی حد مقرر کر دی جائے گی لیکن جب اپنے مولیٰ کا ذکر فرماتے ہیں تو کہتے ہیں۔ "جب وہ چاہے گا تو میری اُمّت کی لپ بھر کر جنّت میں داخل کر دے گا۔

حضور بتانا چاہتے ہیں۔ کہ میری رحمت وشفاعت خدا کی مرضی کے تحت ہوگی، میں اُسی کے بخشتے ہوئے محدود اختیار کے مطابق جہنم سے گنہگاروں کو نکالوں گا۔ لیکن میرا مولیٰ مالک ہے، صاحب اختیار ہے وہ اپنی مالکانہ شان کے ساتھ کرم کرے گا، اس کی رحمت جب برسے گی تو بخشش وکرم کی نہ کوئی حد ہوگی اور نہ اس کی حد مقرر کرنے والا کوئی ہو سکتا ہے یہ فرق ہے "رحمتِ ذاتی" اور "رحمت عطائی" کے درمیان، اور یہی فرق ہے ہر کمالِ ذاتی اور کمالِ عطائی کے درمیان۔

مانتے سب ہیں کہ خدا کے بابرکت بندوں انبیاء علیہم السلام اور اللہ والوں کی تمام صفتیں عطا کردہ ہوتی ہیں، ذاتی کمالات صرف خدا تعالیٰ کے ہیں، لیکن باوجود ماننے کے بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ان دونوں کے درمیان فرق کرتے ہیں۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن دونوں حدیثوں میں اسی فرق کو بیان کیا ہے اور امت کو یہ بتایا ہے کہ رحمتِ ذاتی وہ ہے جس میں دوسرے کی اجازت اور کسی کے حکم کا سوال پیدا نہ ہوتا ہو، آزادانہ اختیار اس میں موجود ہو، اس کے مقابلہ میں رحمت عطائی وہ ہے جو عطا کرنے والے کے اشارہ کے بغیر حرکت نہ کر سکتی ہو، پابند مشیت ہو۔

پس ہر انسان کو چاہیئے کہ رحمٰن ورحیم آقا کی رضا کو اصل مقصد بنائے، اسی کی رضا پر (جس کا دوسرا نام شریعت ہے) چلنے کی کوشش کرے۔

تفسیر کی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک روز رات کے پچھلے حصہ میں

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی عبادت کرتے کرتے اُمت کے گنہگاروں کا خیال آگیا۔ خیال آتے ہی اُمت کی محبت جوش میں آگئی، رو رو کر اُمت کی بخشش کے لئے دُعا شروع کر دی، محبوب کی آہ وزاری سے رحمت الٰہی کو بھی جوش آگیا، آسمانی قاصد جبریل امین حاضر ہوئے، خدا کا سلام محبوب خدا کو پہنچایا اور یہ خوش خبری سنائی کہ خدا تعالیٰ آپ کو امت کی طرف سے خوش کر دے گا۔ غم نہ کیجئے۔! لیکن آخرت کے خوف سے رونے والے نبی کے موم سے زیادہ نرم دِل پر مالک کے قہر و جلال کا اثر اِس قدر چھایا ہوا ہے کہ آسمانی قاصد کی بشارت سے بھی آہ وزاری ختم نہ ہوئی، رحمتِ الٰہی بے قرار تھی، حکم ہوا، جبریل پھر جاؤ، محبوب کو اطمینان دلاؤ، پھر یہ پیغام سناؤ، میں قیامت کے دن آپ کی اُمت کا معاملہ آپ کے سپرد کر دوں گا۔

اب تو آپ خوش ہیں ——؟

رسول پاک امت کے غم گسار ہیں اور مشیت خداوندی کے راز دار ہیں، آپ نے رحمتِ الٰہی کی یہ پیش کش سنی، معاملہ فہم تھے، معاملہ کی تہ کو پہنچ گئے، اُمت کی محبت میں بھی پیغمبرانہ ہوش باقی تھا، اُس ہوش نے اپنا کام کیا، رسول پاک نے جواب دیا۔

جبریل میں اپنی اُمت کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لینا نہیں چاہتا، کیونکہ میری اُمت پر میرا رب مجھ سے زیادہ مہربان ہے۔

اِس سلسلہ میں امام مسلم نے جو روایت نقل کی ہے اُس کے الفاظ یہ ہیں

سَنُرْضِيكَ فِي أُمَّتِكَ وَلَا نَسُوْءُكَ

محدثین رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ دوسرا جملہ بطور تاکید کے اِس لئے لایا گیا ہے کہ۔

اذ ربما یتوھم من سنرضیک نرضیک فی حق البعض ولذا قال ——— ما یرضیٰ محمد و احد من امتہ فی النار

(فتح الملہم ج ۱ ص ۳۶۲)

یعنی یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ آپ کی کچھ امت کو جنت میں داخل کر کے آپ کو خوش کر دے گا، لیکن تاکیدی جملہ لاکر خدا تعالیٰ نے بتا دیا کہ حضور کی پوری اُمت نجات حاصل کرے گی، اس لئے بعض علماء نے کہا ہے۔ کہ حضور کا ایک امتی بھی جہنم میں جائے گا تو حضور خوش نہیں ہوں گے۔

سُبحان اللہ ـــ! یہ ہوتی ہے پیغمبرانہ حکمت، ایک جملہ میں امت کو بتا دیا، حقیقی رحمت خالق کی رحمت ہے، اسی کی رحمت کے لئے بندہ کو جد و جہد کرنی چاہیئے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم "رحمت للعالمین" ہیں اور رب محمد صلی اللہ علیہ وسلم "رب العالمین" ہے۔ "رحمٰنِ کائنات" ہے، رسولِ پاک کی رحمت خدا کی رحمت کا پرتو ہے، ایک حقیقت ہے ایک حقیقت کا پرتو ہے۔

رسولِ اکرم کے ارشاد گرامی کے بعد اِس آیت پر غور فرمائیں۔

فبما رحمۃ من اللہِ لنت لھم ولو کنت فظاً غلیظ القلبِ لَا نفضوا من حولک (آل عمران)	خدا تعالیٰ کی رحمت ہی ہے جو آپ نرم دل ہیں، اگر آپ سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کو چھوڑ کر بھاگ جاتے۔

سورۃ الحجر کی اِس آیت کو بھی غور سے ملاحظہ فرمائیں۔

نبی عبادی انی انا الغفور الرّحیم ۝ خبر سنادے میرے بندوں کو — کہ میں ہوں اصل بخشنے والا مہربان۔

یہ ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ دہلوی کا ہے جسے اہل معرفت نے الہامی ترجمہ کہا ہے، اس میں شاہ صاحب رحؒ نے اَنَّ کی تاکید کا ترجمہ بے شک اور تحقیق کی بجائے "اصل" کے ساتھ کیا ہے، اِس لفظ کو شاہ صاحب نے یہاں لاکر یہ اشارہ کیا ہے کہ بخشنے اور کرم کرنے میں اصل تو وہی ہے، باقی سب نقل ہے جو اسی اصل کا پرتو ہے، عکس ہے اور ظہور ہے۔ پس سمجھنے والوں کو چاہیئے کہ اصل اور عکس کے فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں اور تعریف و توصیف کے کسی موقع پر نقل اور مجاز کیلئے وہ الفاظ، استعارے، تشبیہات استعمال نہ کیا کریں جو رحمت حقیقی کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں تاکہ فرق مراتب باقی رہے۔

بشریت کا اعلان اور توحید الٰہی

لوگ خیال کرتے ہیں کہ سرورِ کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بشریت (انسانیت) کا اعلان ایک راز ہے جسے ہم سمجھنے سے قاصر ہیں، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ اعلان نہ کوئی راز ہے نہ معمہ۔ بلکہ یہ اعلان تو محبوب آقا کی سچائی کی زبردست دلیل ہے — آؤ — اسے سمجھنے کی کوشش کریں اور غور کریں کہ قرآن کریم نے بشریت کے اعلان پر اتنا زور کیوں دیا ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا انسان اِس قدر کچے عقیدہ کا انسان ہے کہ چاند سورج کی روشنی کو دیکھ کر اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے کہ جیسے یہی اُس کے معبود اور پالنے والے ہوں دریاؤں کی روانی کے سامنے سر جھکا دیتا ہے، انسانوں کو بادشاہی کے جاہ وجلال ـــ میں دیکھ کر اُن کے قدموں میں گر پڑنا اپنی عزت وسعادت جانتا ہے، ولی کی کرامت اور نبی کے معجزے کو دیکھتا ہے تو اُنھیں خدا کا بیٹا اور دیوتا کہنے لگتا ہے اور اُنہی کی پوجا شروع کر دیتا ہے۔

ایسی کچے عقیدہ اور کچے خیالات کی گمراہ دنیا میں خدا کے محبوب کا ظہور ہوتا ہے، آپ کی پوری زندگی معجزہ اور کرامت ہے، چالیس سال تک آپ صرف ایک "شریف نوجوان" اور دیانت دار سوداگر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ چالیسویں سال جب آپ غارِ حرا سے اپنی قوم میں آتے ہیں تو اس شان سے آتے ہیں کہ ساری قوم حیرت میں پڑ جاتی ہے۔

ایسا باکمال انسان اگر یہ دعویٰ کرتا کہ یہ سب کچھ میری ذات کے کمالات ہیں، میرے بہترین دماغ کی پیداوار ہیں۔ "میں خدا ہوں" ـ خدا کا اوتار ہوں۔ تو پتھروں کے سامنے سر جھکانے والی دنیا اس شخص کے سامنے بھی سر جھکا دیتی۔

خاص کر قریشِ مکہ۔ وہ تو آپ کو سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ کیونکہ قریش مکہ کی عیسائیوں سے بہت لگتی تھی۔ عیسائی اپنے مقابلہ میں قریش کو جاہل اور بُت پرست کہتے تھے اور اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہم ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام

جیسے نبی آئے جو خدا کے بیٹے ہیں، قریش کے ہاں نہ کوئی رسول آیا تھا نہ کتاب اتری تھی، لے دے کے لات و عزیٰ کی مورتیاں تھیں انھیں وہ سب کچھ سمجھتے تھے اور اپنی ضروریات و حوائج میں انھیں سے مدد مانگتے تھے۔

پس اگر حضور شرک و بت پرستی کی مخالفت کی بجائے اپنے آپ کو دیوتا بنا کر پیش کرتے تو قریش خوشی خوشی آپ کو ایک اچھا دیوتا سمجھ کر اپنے دیوتاؤں میں شامل کر لیتے اور آپ کو گمراہ عیسائیوں کے دیوتا (معاذ اللہ حضرت عیسیٰ) کے مقابلہ میں پیش کر کے فخر کرتے۔

کس نے دیکھا تھا کہ آسمان سے جبریلؑ نام کا ایک فرشتہ آکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں خدا کا کلام ڈالتا ہے، خدا کے نور سے اس کے دل کو روشن کرتا ہے جس کی برکت سے ذات اقدس میں سے یہ سارے کمالات پھوٹ رہے ہیں، حضرت جبریلؑ کا آنا پردہ کی بات تھی، اور اس پردہ کی بات سے کون واقف تھا، اگر حضور پاک دیوتا ہونے کا دعوےٰ کرتے تو دنیا آپ کو سب کچھ مان لیتی۔

مگر دیکھو تو ——— ! وہ صاحب کمال انسان دعویٰ کرتا ہے۔ تو۔ اس بات کا کہ میں خدا کا "رسول ہوں" اور اس کا "بندہ" ہوں۔

یہ اللہ کا محبوب اور پیارا رسول بار بار اعلان کرتا ہے تو اس بات کا کہ میں ایک بشر ہوں، تم جیسا بشر، میرے پاس جو کچھ ہے وہ خدا تعالیٰ کا دیا ہوا ہے، یہ طاقت خدا کی طاقت ہے۔ یہ کلام لفظ بلفظ خدا کا کلام ہے یہ کارنامے اسی کے بخشے ہوئے ہیں، میں تو اس مالک کا اسی طرح بندہ ہوں جس طرح تم بندے ہو

سُبحانَ اللہ ۔ ! کیسی حیرت انگیز سچائی ہے، کیسی امانت داری اور راست بازی ہے ۔ نبی کے سوا کوئی دوسرا ہوتا تو ایسی بے وقوف دُنیا میں دیوتا بن بیٹھتا، لوگوں کو دیکھئے ہو ذرا سی قابلیت پیدا ہوتے ہی فرعون بن جاتے ہیں، اپنے مقابلہ میں سب کو جاہل سمجھتے ہیں مگر یہ سچا انسان اپنی شخصیت میں سے نمودار ہونے والے کمالات کو اپنے حقیقی مالک کے کمالات کہہ رہا ہے اور اسی کی ذات کو اُس کی تعریف کا حق دار قرار دے رہا ہے۔

اب رسولِ پاک کے اِس اعلان کو سامنے رکھئے۔

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ اَنَّمَا اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ط (سورہ کہف)	آپ اعلان کر دیجئے، ! میں تم جیسا ایک اِنسان ہوں، (فرق یہ ہے) کہ مجھ پر میرے رب کا کلام اترتا ہے کہ تمہارا معبود ایک ہے

اِس اعلان سے ایک روحانی پیشوا اور مادہ پرست فلسفی کے درمیان فرق ظاہر کرنا مقصود ہے یعنی مادہ پرست کہتا ہے، سب کچھ میں ہوں، سب کچھ میرا علم ہے، نہ خدا کوئی چیز ہے، نہ مذہب، ۔ خُدا کے رسول کہتے ہیں ۔ سب کچھ خدا ہے، علم بھی اسی کی طرف سے ہے، عقل و فہم بھی۔

مادہ پرست فلسفی بات شروع کرتا ہے اپنی انانیت اور خدا کے انکار سے روحانی پیشوا (نبی اور رسول) اپنے کلام کا آغاز کرتے ہیں اپنی عاجزی اور خدا کی بڑائی سے [1]

---

[1] حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف میں قرآن نے کہا ہے۔

اِنَّ اِبْرَاھِیْمَ کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا لِّلّٰہِ حَنِیْفًا ط (سورہ نحل)	ابراہیم پیشوا تھے، خدا کے فرمانبردار اور مخلص۔

یہ ہے بشریت کے اعلان کا منشار

اِس شرعی حکمت کی روشنی میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ بشریت کی حقیقت کو سمجھنا چاہئے اِس سے واضح ہو جائے گا کہ ——— کونین کے سرور و سردار کو "بشر" کہنا، معاذ اللہ اِن کی توہین ——— نہیں، اُن کی بے مثال سچائی کا اِعلان ہے، اُن کی راست بازی ——— امانتداری کا اقرار ہے۔ ہاں اُمّت میں کون ہے جو محبوب کی ——— بشریت کو بالکل اپنی جیسی بشریت جانتا ہو

حضورؐ کی بشریت اور علم کے مسئلہ میں افراط و تفریط

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت اور آپؐ کے علم کے مسئلہ میں چونکہ کم علم واعظوں نے اُمّت میں تفریق پیدا کر رکھی ہے اور نزاعِ لفظی کو یہ نادان عقائد و ایمان کا اختلافی مسئلہ بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ذیل میں بشریت اور علم غیب کے مسئلہ میں دیوبندی علماء کے بڑے مقتدر مولٰنا شبیر احمد عثمانی اور بریلوی علماء کے سرگردہ مولٰنا احمد رضا خانؒ صاحب اور مولٰنا محمد نعیم صاحب مراد آبادی کی مستند تحریریں نقل کی جاتی ہیں۔

قارئین غور سے دیکھیں کہ یہ سارا اختلاف لفظی نزاع کے سوا اور کیا ہے۔

حضورؐ کی ممتاز بشریت، رسولؐ کی حقیقت

قُل لَّا اَقُولُ لَکُمْ عِندِی خَزَائِنُ اللّٰہِ وَلَا اَعلَمُ الغَیبَ وَلَا اَقُولُ لَکُمْ اِنِّی مَلَکٌ اِن اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوحٰی اِلَیَّ ط (انعام)

ترجمہ :- ——— میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں کہتا ہوں تم سے کہ میں فرشتہ ہوں، میں نہیں اِتباع کرتا مگر اس کا جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے (ترجمہ شیخ الہند رح)

اس پر مولٰنا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا نوٹ ملاحظہ ہو

اس آیت میں منصب رسالت کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے یعنی کوئی شخص جو نبوت کا مدعی ہوگا اس کا دعویٰ یہ نہیں ہوتا کہ تمام مقدوراتِ الٰہیہ کے خزانے اس کے قبضہ میں ہیں کہ جب اس سے کسی امر کی فرمائش کی جائے وہ ضرور دکھلائے یا تمام معلومات غیبیہ وشہادیہ پرخواہ اُن کا اطلاق فرائض رسالت سے ہو یا نہ ہو اس کو مطلع کر دیا گیا ہے کہ جو کچھ تم پوچھو وہ فوراً بتلا دیا کرے یا نوع بشر کے علاوہ وہ کوئی اور نوع ہے جو لوازم بشریت سے اپنی برأت و نزاہت کا ثبوت پیش کرے، جب ان باتوں میں سے وہ کسی چیز کا مدعی نہیں ہوتا تو فرمائشی معجزات اس سے طلب کرنا یا ازراہ تعنت وعناد اس قسم کا سوال کرنا

قیامت کب آئے گی یا یہ کہنا کہ یہ رسول کیسے ہیں جو کھانا کھاتے ہیں اور بازاروں میں خرید و فروخت کے لئے جاتے ہیں اور انہی امور کو معیار تصدیق و تکذیب ٹھہرانا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے

اِلَّا مَا یُوحیٰ ــــــــــــ کے استثنا پر فرماتے ہیں

یعنی پیغمبر اگرچہ نوعِ بشر سے علیحدہ کوئی دوسری نوع نہیں لیکن اِس میں اور باقی انسانوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اِنسانی قوتیں دو قسم کی ہیں ــــــــــــ علمی اور عملی

قوتِ علمیہ کے اعتبار سے نبی اور غیر نبی میں اَعمیٰ اور بصیر، اندھے اور سوانکھے کا فرق سمجھنا چاہیئے۔ نبی کے دل کی آنکھیں ہر وقت مرضیاتِ الٰہی اور تجلّیاتِ ربانی کے دیکھنے کے لئے کھلی رہتی ہیں جس کے بلا واسطہ مشاہدہ سے دوسرے انسان محروم ہیں۔

اور قوت عملیہ کا حال یہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اپنے قول و فعل اور ہر ایک حرکت و سکون میں رضائے الٰہی اور حکم خداوندی کے تابع و مُنقاد ہوتا ہے، وحی سماوی اور احکام الٰہیہ کے خلاف نہ کبھی اُس کا قدم اُٹھ سکتا ہے اور نہ زبان حرکت کر سکتی ہے، ان کی مقدس ہستی اخلاق و اعمال اور کل واقعات زندگی میں تعلیماتِ ربانی اور مرضیاتِ الٰہی کی روشن تصویر ہوتی ہے، جسے دیکھ کر غور و فکر کرنے والوں کو ان کی صداقت اور مامور من اللہ ہونے میں ذرا بھی شُبہ نہیں رہ سکتا۔ (سورہ انعام حمائل شریف مدینہ پریس ص۱۶۲)

آیت بالا کی تشریح کرتے ہوئے مولٰنا نعیم الدین صاحب مراد آبادی اپنی تفسیر کے حاشیہ ع۱۵۹ پر لکھتے ہیں۔

"میرا دعویٰ یہ تو نہیں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں جو تم مجھ سے مال و دولت کا سوال کرو اور میں اس کی طرف التفات نہ کروں تو رسالت سے منکر ہو جاؤ۔ نہ میرا دعویٰ ذاتی غیب دانی کا ہے کہ اگر میں تمہیں گذشتہ یا آئندہ خبریں نہ بتاؤں تو میری نبوت ماننے میں عذر کرو۔

اِس آیت سے سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عِلمِ عطائی کی نفی کسی طرح مراد ہی نہیں ہو سکتی کیونکہ اِس صورت میں تعارض بین الایات کا قائل ہونا پڑے گا "وہو باطل"

سورہ کہف کی آیت قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ الخ کے ترجمہ میں مولٰنا احمد رضا خاں صاحب فرماتے ہیں۔

"تم فرماؤ۔ ! ظاہر صورتِ بشری میں تو میں تم جیسا ہوں"

اس کے حاشیہ پر مولٰنا مراد آبادی فرماتے ہیں۔

کہ مجھ پر بشری اعراض و امراض طاری ہوتے ہیں اور صورتِ خاصہ میں کوئی بھی آپ کا مثل نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حسنِ صورت میں بھی سب سے اعلیٰ و بالا کیا۔ اور حقیقت و روح و باطن کے اعتبار سے تو تمام انبیاء اوصافِ بشری سے اعلیٰ ہیں جیسا کہ شفاء قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ میں ہے اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی رح نے شرح مشکوٰۃ میں فرمایا ہے۔ کہ انبیاء علیہم السّلام کے اجسام و ظواہر تو حدِّ بشریت پر

چھوڑے گئے اور اُن کے ارواح و بواطن بشریت سے بالا اور ملاء اعلیٰ سے متعلق ہیں
(صفحہ ۳۶۴)

معلوم ہوا کہ دونوں فریقوں کے نزدیک ــــــــــــــــــــــــــــ

۱ــــ ظاہری طور پر بشر ہیں، بشریت سے کسی فریق کو انکار نہیں۔
۲ــــ آپ کی بشریت بلکہ تمام پیغمبروں کی بشریت سب سے ممتاز ہوتی ہے
حضور افضل الانبیا ہیں۔ اِس لیئے آپ کی بشریت بھی افضل
اور سب سے اعلیٰ ہے۔

حضورؐ کا علمی مقام

حضور کے علمی مقام پر بحث کرتے ہوئے مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ
سورۂ کہف کے آخر میں فرماتے ہیں۔
"اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت کی باتیں بے انتہا ہیں جو باتیں
تمہارے ظرف و استعداد اور ضرورت کے لائق تبلائی گئی ہیں
حق تعالیٰ کی معلومات میں سے اتنی بھی نہیں جتنا سمندر میں سے
ایک قطرہ"
یہیں سے سمجھ لو کہ قرآن شریف اور کتب سماویہ کے ذریعہ سے خواہ کتنا ہی
وسیع علم بڑی سے بڑی مقدار میں کسی کو دیدیا جائے علمِ الٰہی کے سامنے وہ بھی قلیل،

گونی حد ذاتہ اسے کثیر کہہ سکیں۔

اگلی آیت قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ کے حاشیہ پر فرماتے ہیں۔

"اس آیت میں اشارہ کر دیا ہے کہ نبی کا علم بھی متناہی اور عطائی ہے، علم خداوندی کی طرح ذاتی اور غیر متناہی نہیں

(حمائل شریف صہ ۳۹۵)

آیت سورہ نساء ——— وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ کے تحت فرماتے ہیں

"اس آیت میں بیان ہے اس کا کہ آپ کمالِ علمی میں جو کہ تمام کمالات سے افضل ہے اور اوّل، سب سے فائق ہیں اور اللہ کا فضل آپ پر بے نہایت ہے جو ہمارے بیان اور ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ (۱۲۴)

مولٰنا عثمانی سورۂ تکویر پارہ عم کی آیت وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ

(اور یہ غیب کی باتیں بتانے میں بخیل نہیں) ——— کے حاشیہ پر فرماتے ہیں

"پیغمبر ہر قسم کے غیوب کی خبر دیتا ہے، ماضی کے متعلق ہوں یا مستقبل سے یا اللہ کے اسماء و صفات سے یا احکام شرعیہ سے یا مذاہب کی حقیقت و بطلان سے یا جنت و دوزخ کے احوال سے یا واقعات بعد الموت سے اور ان چیزوں کے بتلانے میں ذرا بخل نہیں کرتا۔

(دیکھو صفحہ ۷۶۴)

ہر دو فریق کی تصریحات سے معلوم ہوا کہ

ا ——— علم غیب و شہود کا علم ذاتی غیر متناہی صرف خدا تعالیٰ کی صفت خاص ہے اس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

۲۔ حضور دوسری صفات کی طرح صفت علم میں بھی تمام کائنات سے افضل ہیں

آپ کا علمی مقام ہماری سمجھ اور بیان سے باہر ہے، اس سے زیادہ کہنا اور حضور کی طرف ایسی صفتیں منسوب کرنا جو قرآن و حدیث کی تصریحات کے خلاف ہیں اسلام کے مزاج توحید کے منافی ہیں یہی وہ غلوِ محبت ہے جس نے نصاریٰ کو گمراہ کر دیا ہے اور اسی کے متعلق حضور نے فرمایا ہے

لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ المسیح بن مریم

میری تعریف میں مبالغہ نہ کرنا جس طرح نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کی تعریف میں مبالغہ کیا۔

دہلی کے مشہور عالم مولانا کرامت اللہ خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ علم غیب کے بارے میں ملاحظہ فرمائیں، مولانا مرحوم بریلوی طبقہ کے نزدیک بھی مسلم بزرگ ہیں اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے خلیفہ ہیں۔

"علم غیب بالذات خداوند تعالیٰ ہی کے واسطے ہے اور اس کے علم کے برابر کسی کو علم نہیں ہو سکتا جیسا کہ وہ اپنی ذات میں یکتا ہے اپنی صفت علم میں بھی یکتا ہے اگر کوئی اس طرح کے علم میں اس کا کسی کو شریک بتاوے وہ بے شک مشرک ہے اور یہی مراد فقہائے حنفیہ کی ہے جہاں نفی علم غیب سے کرتے ہیں اور جن احادیث سے غیر کا عالم بالغیب ہونا ثابت ہوتا ہے وہ باطلاع اللہ تعالیٰ بالعرض مراد ہے۔ فثبت التوفیق بین القولین۔

اب مطلق انکار یا اثبات دلیل جہالت ہے، ہمارے حضور پُر نور
فخر الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کو بے شک بعض غیوبات
من غیب اللہ تعالےٰ کا علم ہے اس کو خداوند تعالیٰ ہی جانتا ہے
ہاں بعد خداوند تعالےٰ کے جس قدر علم آپ کو ہے وہ بے شک
تمام مخلوق سے خواہ وہ فرشتہ ہو یا نبی یا غوث یا جن یا شیاطین
کوئی بھی ہو بڑھ کر ہے اور آپ کا کوئی متماثل نہیں اس صفت میں
حررہٗ محمد کرامت اللہ۔ ص ۱۴۳ تذکیر الاخوان مطبوعہ پاکستان

رسالت پر ایمان اور سیرتِ پاک

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح تمام دنیا کو اپنی رسالت پر ایمان
لانے کی دعوت دیتے تھے اسی طرح آپ خود بھی اپنی رسالت پر ایمان و یقین
رکھتے تھے۔

حضور کو اپنی نبوت کی طرف سے اگر ذرا بھی شبہ ہوتا تو آپ میں اس قدر
خود اعتمادی نہ ہوتی اور راہ حق میں اس استقلال و عزیمت کا اظہار نہ ہوتا۔
جو آپ کی سیرت پاک کے ہر پہلو سے نمایاں ہے اور اگلے بابوں میں جس کا مفصل
تذکرہ آپ کے سامنے آرہا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری زندگی کو دلیل رسالت کے طور پر

پیش کرتے ہوئے فرمایا ——————

فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ افلا تعقلون

میں تم میں ایک عرصہ تک رہا ہوں اس سے پہلے، کیا تم سمجھتے نہیں۔

یعنی اگر تم میرے زبانی دلائل کو چھوڑ کر صرف میری سیرت اور عمل و کردار کو غور سے دیکھ لو تو تم میری نبوّت کے حق ہونے پر آسانی سے ایمان لے آؤ۔

آخرت پر ایمان اور سیرتِ پاک

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کی قائل نہ تھی، یہ لوگ تعجب کرتے تھے کہ انسان مرنے کے بعد کس طرح زندہ ہو گا، آخرت کا عقیدہ اُن کے نزدیک "دیوانہ کی بڑ" سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ لیکن حضور نے قرآنی دلائل کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی اُن کے سامنے رکھدی تو اُن کے دلوں میں آخرت کا یقین اُترتا چلا گیا۔

وہ دیکھتے تھے "محمدؐ" اپنے آپ کو خدا کا پیارا کہتا ہے، قرآن اُسے بے گناہ اور معصوم قرار دیتا ہے، اس کی زبان سے جو نکلتا ہے وہ پورا ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں اعمال کی جوابدہی کا کس قدر خوف ہے خدا کے خوف سے اس کی آنکھیں روتی ہیں، اُس کے پیر کھڑے کھڑے سوجھ جاتے ہیں۔ آخرت کا محاسبہ اگر کوئی عظیم واقعہ نہ ہوتا تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت کیوں ہوتی۔

ایک دفعہ آپ کے رضاعی باپ حضرت حارث رضی اللہ عنہ حضور سے ملنے آئے، مکہ میں آکر لوگوں سے آپ کا پتہ پوچھا، ابوجہل اور اس کے ساتھی آنے والوں کو بہکانے کی تاک میں لگے رہتے تھے اُن لوگوں نے حارث سے کہا۔ حارث ــــ! محمدؐ تو پاگل ہو گئے ہیں۔ تم اُن سے مل کر کیا کروگے حارث نے کہا کیوں ــ؟ آخر محمد کیا کہتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا، وہ کہتے ہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ہوگی ۔ حارث بولے ۔ اچھا مجھے اُن سے ایک بات کر لینے دو ۔ یہ حضور کے پاس پہنچے۔ حضور نے انھیں دیکھ کر اپنی چادر مبارک زمین پر بچھادی، بات چیت ہوئی۔ حارث نے قیامت کا ذکر چھیڑ دیا، حضور نے حارث کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔

ابا جان ــــ! خدا کی قسم جب دن قیامت قائم ہوگی میں اس دن اسطرح تمہارا ہاتھ پکڑ کر جتاؤں گا کہ دیکھو ــ! ابا جان ــ! یہ قیامت ہوگئی۔

بات چیت ختم کر کے حارث باہر آئے۔ تو ابوجہل کے آدمی باہر انتظار کر رہے تھے، انھوں نے حارث کو گھیر لیا، بولے ــ حارث کیا دیکھا ــ؟ حارث بولے، خدا کی قسم میرا بیٹا قیامت کے دن جب میرا ہاتھ پکڑے گا تو مجھے جنّت سے ورے نہیں چھوڑے گا۔

مخالف لوگ حارث کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گئے اور یہ کہتے ہوئے چلے گئے۔" حارث پر محمدؐ کا جادو چل گیا۔

یہ حضور کے یقین کی کیفیت کا حال تھا عملی طور آپ کی زندگی آخرت کے یقین کے لئے کتنی موثر دلیل بن گئی تھی۔ اگلے بابوں میں اس کا مفصّل بیان آئے گا۔

حضورؐ خاتم النبیین کی حیثیت سے

ترے دَورِ رسالت کا تعین ہو نہیں سکتا
ازل آغاز ہے ساقی، ابد انجام ہے ساقی

ہر نبی روحانیت کا چراغ تھا البتہ جس طرح چراغوں کی روشنی میں فرق ہوتا ہے، اسی طرح خدا کے رسولوں میں کسی کی روشنی کم تھی کسی کی زیادہ اگرچہ انسانی ضرورت کے مطابق ہر روشنی اپنی جگہ کافی تھی ___ جب روحانیت کے چھوٹے بڑے چراغ اپنا اپنا کام ختم کر چکے اور دنیا نے چاند تاروں کے بعد روشن آفتاب کی ضرورت محسوس کی جو شامِ قیامت تک تمام کائنات کو روشنی پہنچاتا رہے تو خدا تعالیٰ نے نبوّت کے آفتابِ عالمتاب کو بھیجا جس کی روشنی کے بعد انسان ہر روشنی سے بے نیاز ہو گیا اور ہر روشنی اس کے مقابلہ میں ماند پڑ گئی۔ بقول میر

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ دیکھا ہے
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین
لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کو ختم کرنے والے

اگلوں میں جاتا پہچانا نبی

مسند نشینِ انجمنِ کن فکاں ہے تو
مہرِ قبول و خاتمِ پیغمبراں ہے تو

ہر نبی نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر دی اِس لئے قرآن نے آپ کو جانا پہچانا اور متعارف نبی کہا۔

الذین اٰتینٰاھُم الکتاب یعرفونھم کما یعرفون ابناءھم (سورۂ بقرہ)

جن لوگوں کو ہم نے آسمانی کتاب دی وہ آپ کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو۔

توراۃ نے بنی اسرائیل کو بتایا تھا کہ ——— جب وہ لوگ نبی موعود پر ایمان لائیں گے تو خدائے تعالیٰ دنیا میں اُنھیں ایک ممتاز قوم بنادے گا بنی اسرائیل اِسی وجہ سے اپنی ذلّت کے زمانے میں آخری نبی کی بعثت کے لیئے دعائیں کرتے تھے، نیز اس کی بابرکت شخصیت کا واسطہ دے کر دشمنوں پر فتح مندی طلب کرتے تھے۔

وکانوا مِن قبل یستفتِحُوْنَ عَلَی الذین کفروا فلما جاءھم ما عرفوا کفروا بہٖ (سورہ بقرہ)

وہ لوگ فتح طلب کرتے تھے کافروں کے مقابلہ میں لیکن جب ان کے پاس وہ رسول خود پہنچا جسے اُنھوں نے پہچان لیا تو اس کی نبوت سے اِنکار کر دیا۔

حضورؐ عالمگیر نبی کی حیثیت سے

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَافَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا

اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے کافی بنا کر بھیجا ہے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا

ابتک ہر قوم کے لئے الگ رسول آیا۔ جس نے صرف اپنی قوم پر نظر ڈالی، قوم نے بھی اپنے رسول کے سوا کسی سے کوئی واسطہ نہ رکھا اس سے قوموں میں تفریق قائم رہی لیکن جب دنیائے انسانیت حد بلوغ کو پہنچ گئی اور مشیتِ الٰہی نے قومی اور نسلی امتیاز ختم کرکے "انسانی برادری" اور بین الاقوامی اتحاد قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو تمام جہان کے رب نے اپنا آخری رسول بھیجا جو تمام قوموں اور تمام ملکوں کے لئے آیا سب کو ایک دین پر جمع کرنے آیا، تمام پچھلے رسولوں کی بزرگی کو سچا بتاتے ہوئے آیا۔ سب کی عزت کرنے کی تلقین کرتا ہوا آیا۔ اس لئے وہ "رحمۃ للعالمین" کہلایا۔

حضور متلاشیِ حق کی حیثیت سے

اِنما انت منذر، ولکل قومٍ ھاد

ترجمہ:۔ بے شک آپ لوگوں کو ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے آپ ہادی ہیں[1]

نبوت کا منصب وہبی ہے، کسبی نہیں ہے یعنی نبوت کا مرتبہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے کوئی انسان اپنی عبادت و ریاضت سے اس مرتبہ کو حاصل نہیں کر سکتا یہی وجہ ہے کہ نبوت کے اعلان سے پہلے بھی ہونے والے

---

[1] بعض مفسرین کے قول کے مطابق راقم نے لفظ (ھاد) کو حضور کی صفت قرار دے کر آیت کا ترجمہ کیا ہے۔

نبی کی ساری زندگی اپنے ماحول میں عظیم الشان امتیاز کی مالک ہوتی ہے۔ نبوت کے آثار اس کی شخصیت میں الگ نظر آتے ہیں، اس کی ہر ادا یہ بتاتی ہے کہ یہ انسان آگے چل کر کوئی نمایاں کارنامہ انجام دے گا۔

خدا کے آخری رسول کو دیکھو ـــ!

پوری قوم بت پرست ہے، چاند، تاروں کی پوجا پر فخر کرتی ہے ذلیل سے ذلیل چیز کے سامنے سر جھکانے میں بھی کسی قسم کا عار محسوس نہیں کرتی مگر اس قوم میں ایک نوجوان ہے جو اپنے "قومی دین" کو انسانیت کی توہین سمجھ رہا ہے۔ وہ اس طریقۂ بندگی سے قطعاً بیزار ہے، غیر مطمئن ہے وہ کسی مخلوق کے سامنے سر جھکانے، بتوں کے چڑھاوے کا کھانا بھی قبول نہیں کرتا وہ اس بت پرست قوم میں پلا ہے اس ماحول میں اس نے آنکھیں کھولی ہیں مگر وہ اس سماج سے گھبرا کر پہاڑوں کی اندھیریوں میں جا چھپتا ہے، تاریک آبادیوں سے بھاگ کر ویرانوں سے دل لگاتا ہے، چلہ کشی کرتا ہے روزہ رکھ رکھ کر اپنی روح اور دل و دماغ کو اور زیادہ پاک صاف کرتا ہے، سوچتا ہے، غور و فکر کرتا ہے اس کی سلیم فطرت سچے دین کی روشنی کے لئے بے قرار ہے۔

اس نوجوان کا گھرانا کعبہ کی مقدس یادگار کا متولی ہے۔ اس کے بزرگ خانقاہ براہیمی کی سجادہ نشینی کی عزت سے سرفراز ہیں، یہ نوجوان اس خاندان کا چشم و چراغ ہے، ہاشمی سردار عبد المطلب جیسے دادا کی آنکھ کا تارا ہے اور عباس، ابی طالب، ابولہب اور حمزہ رض جیسے چچاؤں کے دل کا قرار ہے اس نوجوان کو خاندانی عزت پکار رہی ہے کہ باپ دادا کے مذہب پر چلے

ان کی گدی سنبھال۔ عرب کی سرداری اب تیرے قدموں میں ہوگی، لیکن یہ نوجوان نہ اس طمع کی طرف جھکتا ہے، نہ باپ دادا کے نام کی لاج کا خیال اسے اپنی طرف کھینچتا ہے، یہ سخت بیزار ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہو کر پتھروں کے سامنے کیوں سر جھکاتا ہے، جس پیشانی کو قدسیوں نے چوما ہو وہ پیشانی چاند تاروں کے آگے کیوں ذلیل ہو رہی ہے وہ انسانیت کی تذلیل سے سخت نالاں ہے اور حق کی تلاش میں جنگلوں اور پہاڑوں میں مارا مارا پھرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے۔

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ؎ (سورہ والضحیٰ) — اور اس نے تم کو تلاش حق میں سرگرداں پایا، پس تم کو ہدایت کی روشنی دکھائی۔

اس نوجوان کا ایک پڑوسی کہتا ہے میں نے ایک روز اس نوجوان کو اپنی بیوی خدیجۃ الکبریٰ سے باتیں کرتے ہوئے سُنا۔ یہ کہہ رہا تھا۔ خدا کی قسم میں کبھی عزیٰ کی پوجا نہیں کروں گا ؎۲

یہ ہاشمی نوجوان جب خدیجہ کبریٰ کے قافلۂ تجارت کے ساتھ مکہ سے باہر گیا تو اس موقع پر ایک خریدار سے آپ کا کچھ جھگڑا ہو گیا۔ گاہک نے عرب کے

؎ اس آیت میں ضَالًّا کے معنی "گمراہ" یا "راہ بھولا ہوا" صحیح نہیں ہے جیسا کہ مترجمین نے کیا ہے، یہ معنیٰ اس وقت صحیح ہو سکتے ہیں جب حق موجود ہو اور اُسے چھوڑ دیا جائے یا وہ چھوٹ جائے، لیکن حق موجود ہی نہیں تو اس حق کو بھول جانے یا گم کرنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے، حق تو حضور کے ذریعہ ظاہر ہوا۔ ؎۲ خصائص کبریٰ ص ۹۵ ج ۹

دستور کے مطابق اِس ہاشمی سوداگر سے کہا۔

اَحْلِفْ بِاللَّاتِ وَالْعُزّٰی — لات و عزیٰ کی قسم کھائیے

ہاشمی سوداگر نے بڑی حقارت سے اِس قسم کو ٹھکرا دیا۔ فرمایا۔ خدا کی قسم میں ہرگز اِن بتوں کی قسم نہ کھاؤں گا۔ گاہک نے اِس سوداگر کے تیور دیکھے اس کے باوقار چہرے پر نظر ڈالی، پیچھے ہٹ کر آپ کے ساتھی اور خدیجہ کے غلام میسرہ سے آپ کی بڑی تعریف کی اور بڑی حیرت سے کہا۔

"اس ماحول میں یہ نوجوان بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے" [۱]

قومی میلوں اور تہواروں کو سماج میں بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے مگر یہ ہاشمی نوجوان حق کا متلاشی اپنی قوم کے مشرکانہ میلوں اور توہم پرستانہ مراسم سے دُور تھا

ایک دفعہ اِس صالح نوجوان سے اس کے چچاؤں اور پھوپیوں نے اصرار کیا کہ بیٹا ہمارے ساتھ تہوار کی خوشی میں شریک ہو جاؤ لیکن اس نے ساتھ چلنے سے معذوری ظاہر کی۔ جب عزیزوں کا بہت زور پڑا تو آپ گھر سے چلے گئے، چند روز کے بعد واپس آئے۔ گھر کی عورتوں نے پوچھا بیٹا کہاں تھے بولے — میری طبیعت پر کچھ اثر تھا، عورتیں اس کا مطلب یہ سمجھیں کہ شاید آپ کو جن بھوت کے اثر کا خیال ہو گیا ہے تو اس پر عورتوں نے آپ کی غلط فہمی دُور کرنے کے لیے کہا۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَبْتَلِيَكَ بِالشَّيْطَانِ — یہ بات نہیں کہ خدا تم کو شیطان کے اثر میں مبتلا کرے۔

---

[۱] تاریخ ابن سعد جلد اوّل صـ ۱۰۲

وفیک من خصال الخیر ؎ حالانکہ تمہارے اندر اچھی عادتیں ہیں

اس نوجوان کی قوم کی وحشت اور جہالت کا یہ عالم ہے کہ وہ حلال وحرام اور پاک وناپاک کی تمیز سے بالکل محروم ہے جو چیز سامنے آگئی اُسے کھالیا۔ لوگ نہ کیڑے مکوڑوں کو چھوڑتے ہیں نہ مُردار جانوروں کو، خون کو جما کر اس کی قاشیں کاٹ کر کھانے کا عام رواج ہے، بتوں کے نذرانوں اور تھانوں کے چڑھاوے تبرک سمجھے جاتے ہیں لیکن یہ "ہاشمی جوان" اپنی سلیم فطرت اور پاکیزہ ذوق سے مجبور رہے یہ اس قسم کے کھانوں سے دُور بھاگتا ہے۔ اس قسم کے کھانے دعوتوں پر آتے ہیں تو وہ کھانے سے انکار کر دیتا ہے۔

ایک مجلس میں آپ کے سامنے چڑھاوے کا کھانا لایا گیا۔ آپ نے یہ کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا "میں بتوں کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانوروں اور بتوں کے چڑھاوے نہیں کھاتا۔ میں تو صرف وہی چیز کھاتا ہوں جس پر خدا کا نام لیا جاتا ہے"

حضور ایک شریف نوجوان کی حیثیت سے

رُخِ مصطفٰے ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری چشمِ خیال میں، نہ دوکانِ آئینہ ساز میں

(لطیف بدایونی)

؎ فتح الباری جلد ۷، ص ۱۰۳

عرب جس طرح توحید کی روشنی سے محروم تھے اسی طرح تہذیب و شائستگی سے بھی بیگانہ تھے، ان کی زندگی نہایت گندی تھی، اُن کے طریقے نہایت وحشیانہ تھے، زنا، شراب، جوا، چوری، رہزنی اور قتل و خونریزی اُن کی زندگی کے معمولات تھے، وہ ایک دوسرے کے سامنے ننگا ہونے میں ذرا تکلف نہ کرتے تھے، حرم کعبہ جیسی مقدس جگہ میں عورتیں ننگی ہو کر طواف کرتی تھیں۔ بے شرمی کی حد تھی کہ ایک بیٹا اپنے باپ کے بعد اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کر لیتا تھا۔ عرب کے مایۂ ناز شاعر اپنی بہنوں سے عشق بازی کرتے تھے اور پھر شاعری کرتے تھے، بڑے بڑے دولت مند لوگ اپنی لونڈیوں سے بدکاری کراتے تھے اور اس ناپاک کمائی سے عیش و عشرت کی داد دیتے تھے۔

ایسے بے حیا لوگوں کے درمیان ایک نوجوان اِس قدر حیادار ہے کہ زندگی میں اس کو کسی نے ننگا نہیں دیکھا، بداخلاقی کے طوفانوں میں گھرا ہُوا ہو کر بھی شراب کے قریب نہیں جاتا، جوئے کو ہاتھ تک نہیں لگاتا طبیعت اِس قدر حیادار پائی ہے کہ رفع حاجت کے لیئے آبادی سے دُور جنگل میں جاتا ہے مکّہ کا قابل دید نوجوان ہے، بھرپور شباب اور بے داغ حسن کا مالک ہے، جس طرف نکل جاتا ہے اس کی معصوم جوانی کی طرف لوگوں کی نظریں اُٹھتی ہیں، لوگ مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں کہ عرب کا کونسا بھولا بھالا حسین چلا جا رہا ہے، مکہ کی دوشیزائیں تمنّا ئیں ہیں کہ اے کاش —! اس کی معصوم نگاہیں ہمیں منتخب کر لیں، مگر توبہ، توبہ کیا مجال کہ اس کی پاکباز نگاہیں کسی طرف اُٹھ جائیں، وہ ہر غلط خواہش کو حقارت سے ٹھکراتا ہوا چلا جاتا ہے

اس کی پاکدامنی پر فرشتوں کو رشک آتا ہے۔

اس نوجوان کی معصوم زندگی میں اس کے سماج اور اس کی فطرت کے درمیان کئی مرتبہ کش مکش ہوئی اور اس ٹکراؤ میں اس کی فطرت ہمیشہ فتح مند ہوئی، اور سماج اور ماحول کے اثرات نے شکستِ فاش کھائی۔

ایک عجیب واقعہ خود اُس معصوم کی زبانی سنیئے

مجھے جاہلیت کی کسی بات کا کبھی خیال نہیں آیا۔ صرف دو دفعہ ایسا موقع آیا مگر خدا نے مجھے بچا لیا، ـ رسول پاک نے پھر پورا قصہ سُنایا۔

ایک رات کا ذکر ہے کہ میں نے اپنے ساتھی سے جو میرے ساتھ بکریاں چرایا کرتا تھا کہا۔ تم میری بکریوں کا خیال رکھنا میں شہر (مکّہ) جا کر ذرا کہانیاں سُن آؤں ــــ میں شہر میں آیا، ایک مکان کے سامنے سے گزرا تو مجھے وہاں سے گانے بجانے کی آواز آئی۔ میں نے پوچھا۔ یہ آواز کیسی ہے؟ معلوم ہُوا کہ فلاں شخص کی شادی ہے۔ میں گانا سننے کے خیال سے وہاں بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ مجھ پر نیند طاری ہو گئی اور میرے کانوں پر مہر لگ گئی، بس اس وقت کا سویا سویا میں اُس وقت اُٹھا جب آفتاب کی گرم گرم شعاعوں نے مجھے بیدار کیا۔ گانے بجانے کی مجلس برخاست ہو چکی تھی، میں اُٹھا اور اپنی بکریوں میں آیا، میرے ساتھی نے پوچھا کیا سُن کر آئے۔ میں نے سارا واقعہ سنایا۔

پھر دوسرے دن بھی میں نے اِسی قسم کا پروگرام بنایا اور اس دفعہ بھی

میری فطرت نے اس تعیش کے شغل میں شریک ہونے سے انکار کر دیا، اس کے بعد پھر کبھی میں نے اس قسم کا خیال ہی نہیں کیا یہاں تک کہ خدا تعالےٰ نے مجھے نبوّت سے سرفراز فرما دیا۔

خدا کی قدرت دیکھیے ۔۔۔!

شرم وحیا سے بالکل کورے معاشرہ میں، ایسی باحیا فطرت، کہ کعبہ کی تعمیر کے موقعہ پر یہ بچہؐ قوم کے بزرگوں اور ساتھیوں کے ساتھ پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہا تھا۔ اس کے چچا عبّاس نے دیکھا کہ یہ نرم ونازک بدن اس پتھروں کی ٹوکری کہیں جسم پر خراش نہ آجائے، سر پر چوٹ نہ لگ جائے۔ چچا نے ترس کھا کر بھتیجے کا تہبند گھسیٹ لیا اور اُسے سر پر رکھ دیا بس کیا تھا اس غیور لڑکے کا ستر کھلا اور یہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اور اس کی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں، پھر کچھ دیر کے بعد ہوش آیا اور آپ نے فرمایا۔

"میرا تہبند، میرا تہبند"۔

اس پر آپ کے چچا نے فوراً تہبند باندھ دیا (فتح الملہم جلد ۱ صـ ۴۸۲)

ابو طفیل کی روایت میں ہے کہ ۔۔۔ آپ کو غیب سے یہ آواز سنائی دی

یا محمد عورتك

محمد، اپنی شرمگاہ کا خیال رکھو، ستر کی حفاظت کرو۔

عالم غیب کی یہ پہلی آواز تھی جو حضورؐ نے سُنی

حضورؐ امن پسند رہنما کی حیثیت سے

معمولی معمولی باتوں پر لڑ مرنا، قتل و غارتگری پر تیار ہو جانا۔ عرب کا عام شیوہ تھا، ذرا سی بات پر جنگ شروع ہوتی اور برسوں چلتی رہتی۔ گھوڑ دوڑ پر جنگ چھڑی تو دو قبیلوں کے درمیان چالیس سال تک خونریزی ہوتی رہی، کسی کی اونٹنی کھیت میں گھس گئی کھیت والے نے اونٹنی کا تھن زخمی کر دیا بس خون کی ندیاں بہہ گئیں۔

اِن سفاکوں اور لڑاکو انسانوں کے درمیان ایک ہی شخص تھا جو امن پسندی اور صلح جوئی میں ہر طرف مشہور تھا، یہ ۳۵ سالہ نوجوان تھا اس کی رگوں میں بھی ہاشمی خون رواں دواں تھا مگر طبیعت اس نے انتہائی شریفانہ اور محبت نواز پائی تھی، غلط جوش و خروش کی اس کو ہوا تک نہ لگی تھی۔

نبوت سے پہلے حجرِ اسود نصب کرنے کا قصہ پیش آیا۔ ہر قبیلہ نے کعبہ کے کچھ حصہ کو تعمیر کیا تھا، اور اس سعادت میں عرب کا ہر خاندان شریک ہو گیا تھا تعمیر کے بعد حجر اسود کے نصب کرنے پر جھگڑا کھڑا ہو گیا، ہر قبیلہ یہ چاہتا تھا کہ یہ سعادت ہمارے حصہ میں آئے، بات اتنی بڑھی کہ تلواریں نکل آئیں، خون سے بھرے ہوئے پیالوں میں انگلیاں ڈبو کر قسمیں کھائی جانے لگیں۔

اسی جھگڑے میں چار دن ہو گئے، پانچویں دن قریش کے بوڑھے سردار ابو اُمیہ بن مغیرہ نے یہ تجویز پیش کی کہ جو شخص صبح کو سب سے پہلے کعبہ میں آجائے اُسی کو اس معاملہ میں ثالث بنا لیا جائے پھر جو وہ حکم دے اس کی تعمیل کی جائے

سب نے بخوشی یہ تجویز منظور کر لی، صبح کو ہر شخص سب سے پہلے پہنچنے کے ارادہ سے جلدی جلدی گھر سے نکلا لیکن حرم میں داخل ہو کر سب نے یہ دیکھا کہ عرب کا وہ جواں سال و جواں بخت نوجوان کعبہ میں سب سے پہلے موجود ہے جس کو ——— ——— عبد اللہ کا یتیم کہتے ہیں۔

قرار داد کے مطابق آپ کو یہ حق پہنچ گیا۔ کہ آپ اگر چاہیں تو حجرِ اسود کو اپنے مبارک ہاتھوں سے نصب فرما دیں۔ یہ بڑی عزت تھی جس کے آپ مستحق ہوئے، یہ اشارہ تھا کہ دین ابراہیمی کی تجدید کا سنگِ بنیاد اسی ہونہار نوجوان کے ہاتھ سے رکھا جائے گا۔

حجرِ اسود کو لگانے کا حق جب آپ کو مل گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا "جو قبیلے اپنے آپ کو اس شرف کا حقدار سمجھتے ہیں وہ اپنا ایک ایک نمائندہ چن کر مجھے دیں، نمائندے چنے گئے آپ نے یہ تدبیر فرمائی کہ اپنی مبارک چادر زمین پر بچھائی اور حجرِ اسود کو اس پر رکھ دیا، پھر ان منتخب نمائندوں سے کہا کہ وہ چادر کے کونے پکڑ کر اٹھائیں اور اسے کعبہ کی دیوار کے پاس رکھ دیں جب حجرِ اسود اپنی جگہ کے پاس آگیا تو آپ نے اسے اٹھا کر اس کی جگہ پر نصب کر دیا۔

حضور کی اس دانشمندانہ اور صلح جویانہ تدبیر سے کشت و خون کا خطرہ ٹل گیا۔ عرب کے بڑے بڑے سردار اس لڑکے کی تدبیر پر عش عش کرنے لگے۔

عرب کی مشہور جنگ "حرب فجار" میں آپ نے شرکت فرمائی اس جنگ میں قریش حق پر تھے، اس لئے آپ اس جنگ میں شریک تو ضرور ہوئے البتہ کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔

یہ نبی بننے سے پہلے واقعات ہیں، نبی ہونے کے بعد دیکھو ـــــ!

مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آرہے ہیں مدینہ والے بھی کافی تعداد میں مسلمان ہو چکے ہیں، مدینہ کے یہودی مدینہ میں اسلام کی روشنی پھیلنے سے گھبرا رہے ہیں، انھیں خطرہ ہو رہا ہے کہ کہیں مسلمانوں کی طاقت انھیں پریشان نہ کرے، صلح پسند پیغمبر یہودیوں کے اس خوف کو محسوس فرماتے ہیں۔ میل ملاپ اور امن کے دعویدار یہودیوں کی اس گھبراہٹ کو دور فرماتے ہیں۔ اور مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک معاہدہ طے ہوتا ہے جس میں حسب ذیل شرائط لکھے جاتے ہیں۔

١ ـــ یہودیوں کو مذہب اور عقیدے کی مکمل آزادی حاصل رہے گی۔

٢ ـــ مسلمان اور یہودی دونوں دوستوں کی طرح رہیں گے۔

٣ ـــ جب کوئی تیسرا ـــــــ مسلمانوں اور یہودیوں کے پیارے وطن مدینہ پر حملہ کرے گا تو دونوں متحد ہو کر شانہ بشانہ دشمن کا مقابلہ کریں گے۔

سیاسی نقطۂ نظر سے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اقدام بڑا تعمیری اقدام تھا، اس معاہدہ سے مدینۂ پاک میں دونوں قوموں کے لئے امن و امان سے رہنے کی فضا پیدا ہو گئی۔

تاریخ کا مطالعہ کرو ـــــــ تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان میل ملاپ سے رہنے کا یہ سمجھوتہ خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی تدبّر اور اجتماعی دور اندیشی کا بہترین ثبوت ہے۔

اور آگے بڑھیے ـــــــ یہ حُدیبیہ کا میدان ہے اور

یہ چودہ سو مسلمان یہاں جو پڑے ہیں وہ کعبۃ اللہ کی زیارت کے لئے مدینہ سے نکلے ہیں، یہ چھ سال کے بعد اپنے پیارے وطن کی طرف واپس ہوئے ہیں، انھیں مکہ سے مار مار کر نکالا گیا تھا، اِن کا دل نہ چاہتا تھا کہ وطن کو چھوڑیں، یہ مدینہ میں ہر طرح کا آرام پانے کے باوجود اپنے وطن کی گلیوں، بازاروں، چشموں باغوں کو یاد کر کر کے روتے تھے۔

اِن کی قریش مکہ سے لڑائی ضرور تھی مگر اِس وقت یہ لڑائی کے لئے نہیں نکلے تھے، اِن کے پاس ہتھیار نہیں ہیں، یہ اِحرام باندھے ہوئے ہیں ان کے ساتھ قربانی کے اونٹ بھی ہیں اور یہ سب باتیں اِس بات کی دلیل ہیں کہ یہ زیارتِ بیت اللہ کے لئے آئے ہیں۔

یہ مہینے "اشہرِ حُرُم" کہلاتے ہیں ان میں عرب لڑائی بھڑائی کو حرام سمجھتے ہیں، سارے سال لڑتے ہیں لیکن اِن چار مہینوں میں تلواریں میان میں رہتی ہیں، اِن دنوں دوست دشمن کسی کے لئے کعبہ میں آنے کی روک ٹوک نہیں ہوتی۔ سب شانہ بشانہ کعبہ میں حج کی رسمیں ادا کرتے ہیں۔ اِس قدیم دستور کے مطابق آج مسلمانوں کے واسطے کعبہ جانے کے لئے کوئی روک نہ ہونی چاہئے، لیکن کس قدر زیادتی ہے قریش کے مغرور سرداروں کی کہ اِعلان کیا جا رہا ہے کہ مسلمان مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے،

اِس زیادتی پر اِس قومی دستور کی خلاف ورزی پر مسلمانوں میں جوش و خروش پھیل گیا ہے، ہر شخص کہہ رہا ہے آج ہم اپنے حق کے لئے جان دیدیں گے یہ ظلم برداشت نہ کریں گے۔

حالات بے حد سنگین ہو چکے ہیں، ایک ایک صحابی خدا کے لئے جان دینے کو تیار ہے اور خدا کے رسول کے ہاتھ پر موت کی بیعت کر چکا ہے، قریب ہے کہ حدیبیہ گاؤں کا یہ میدان انسانی خون سے لالہ زار بن جائے، مگر صلح پسند رسول درگزر اور ضبط سے کام لیتے ہیں، قریش کو ضد ہے کہ اس سال واپس چلے جاؤ ورنہ ہماری بات خراب ہو جائے گی، حضور ان کی شرائط کو منظور فرما لیتے ہیں۔ اور صلح کے شرائط یہ طے پاتے ہیں۔

۱ــــ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔

۲ــــ اگلے سال آئیں اور صرف تین دن قیام کر کے چلے جائیں۔

۳ــــ ہتھیار لگا کر نہ آئیں

۴ــــ مکہ میں جو مسلمان قید ہیں انھیں اپنے ساتھ لے کر نہ جائیں اور جو مسلمان مکہ میں رہ جانا چاہے اس کو نہ روکیں۔

۵ــــ جو شخص مدینہ جائے اس کو واپس کر دیا جائے اور جو مدینہ سے مکہ آئے اس کی واپسی ضروری نہیں۔

رسولِ امین

اپنی سیرت اور پیغامات کی روشنی میں

"امانت" کی صفت منصب نبوّت کا ایک اہم امتیاز اور بنیادی خصوصیت ہے، ایک رسول کو پہچاننے کے لیے جہاں اور بہت سی فطری اور عملی خوبیاں ضروری ہوتی ہیں وہاں امانت کا اخلاقی جوہر اس بارے میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے نبوّت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد ہی نہیں، نبوّت کے اعلان سے پہلے بھی ہونے والا رسول اپنی امانت میں مشہور ہو جاتا ہے، تمام قوم میں اس کی امانداری نہایت ممتاز مقام حاصل کر لیتی ہے، امانت داری کا نام آتے ہی اسی انسان کی طرف لوگوں کا خیال جاتا ہے جو آگے چل کر رسول کی حیثیت سے قوم کو ہدایت کا پیغام دیتا ہے، پھر صرف وہ امانت ہی نہیں جو روپے پیسے، جائداد اور مال میں اختیار کی جاتی ہے بلکہ وہ امانت جو زندگی کے تمام چھوٹے بڑے حقوق کے پورا کرنے پر شامل ہوتی ہے۔

امانت رسالت کے لئے لازمی ہے

لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا کے رسول صرف عقائد کی سچائی میں روشنی کا آفتاب و ماہتاب ہوتے ہیں، نہیں۔ بلکہ خدا کے رسول عقائد

کی طرح لین دین اور معاملات میں بھی مثالی کیرکٹر رکھتے ہیں۔

پچھلے رسولوں میں حضرت شعیب علیہ السّلام ایک رسول تھے ان کی قوم "قوم مدین" خدا کی وحدانیت کے انکار کے ساتھ ساتھ معاملات کی بد دیانتی اور حق تلفی میں بھی گرفتار تھی، کم تولنا، کم ناپنا، لوگوں کا مال مار لینا ان لوگوں کا دستور تھا۔

حضرت شعیبؑ علیہ السلام نے اس قوم کی ہدایت شروع فرمائی اور ایک خدا پر یقین لانے کی دعوت کے ساتھ ساتھ اِن کو یہ بھی نصیحت فرمائی کہ لوگوں کی حق تلفی کرنا، ناپ تول میں بے ایمانی کرنا چھوڑ دو۔

اس کے مقابلہ میں قوم نے طعنے دیئے، دھمکیاں دیں مگر خدا کے رسول نے دیانتداری کی نصیحت سے دست برداری اختیار نہیں کی اور توحید و امانت کے دونوں پیغام برابر جاری رکھے۔

نبوّت کے لئے میں نے امانت کی صفت کو بنیادی صفت کہا ہے کیونکہ رسول خدا کا قاصد ہوتا ہے، جس کا کام خدا کے پیغام کی امانت کو بے کم و کاست اس کے بندوں تک پہنچانا ہوتا ہے اس لئے قاصد کا امانتدار ہونا بہت ضروری ہے، قاصد اگر امین نہ ہو تو وہ اپنے فرائض منصبی کو ادا نہیں کرسکتا۔ پس یہی وہ امانت ہے جو رسول کی پوری زندگی کو امانت و ایمانداری کا بے مثل نمونہ بنا دیتی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے خدا کے بندوں سے کہا۔

انی لکم رسول امین (شعراء) میں تمہارے لئے امانتدار قاصد ہوں۔

حضرت ہودؑ علیہ السّلام نے بھی اپنی قوم سے یہی فرمایا۔ کہ میں خدا کا امانت دار اور معتبر قاصد ہوں۔

اِس حقیقت کو خدا کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک نے بالکل واضح کر دیا ہے۔

عرب جیسی گمراہ قوم، توہم پرستی کا شکار، سماجی بُرائیوں میں گرفتار، ماحول کا ماحول گندا ایسے بگڑے ہوئے ماحول میں ایک نوجوان نمودار ہوتا ہے یہ بچپن ہی میں باپ دادا کے سائے سے محروم ہوا، اسے اپنے خاندانی ماحول میں جو تھوڑی بہت تربیت ـــ مل سکتی تھی وہ بھی اِسے میسّر نہ ہوئی، اِس بچے نے ہوش سنبھالا تو اسے بدّو لڑکوں کے ساتھ بکریاں چرانی پڑیں اور بڑا ہوا تو تجارت میں پڑ گیا، برسوں سوداگری کرتا رہا۔ اِس تجارتی زندگی میں اُس نے ایسی اپنی ساکھ بنائی کہ وہ ساری قوم میں امین کے لقب سے مشہور ہو گیا اس کا واسطہ رات دن جاہلوں اور بدمعاملہ لوگوں سے پڑتا لیکن وہ کبھی کسی کے ساتھ بدمعاملہ نہیں بنتا، جہاں لوگ ایک دوسرے کا ہزاروں کا مال لُوٹتے کھسوٹتے، انہی میں رہ کر یہ شخص ایک پیسہ ناجائز طریقہ سے نہ کماتا، کبھی اِس کی نیت خراب نہ ہوتی، ساری قوم اس پر اتنا بھروسہ کرنے لگتی ہے کہ ہر شخص اپنا قیمتی مال اِس کے پاس رکھواتا ہے اور وہ اِن کے مالوں کی اپنے مال کی طرح حفاظت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ نوجوان حق پرستی اور حق گوئی کے جرم میں ساری قوم کی نگاہوں میں بُرا ہو جاتا ہے۔

قوم کی قوم اس کی جان لیوا بن جاتی ہے، طرح طرح کے الزام لگا کر

اس کی شخصیت کو بے اثر اور بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، دیوانہ کہا
جاتا ہے ـــــ جادوگر کہا جاتا ہے ـــــ سب کچھ کہا جاتا ہے ـــــ مگر
کسی مخالف کو ـــ "بددیانت" کہنے کی جرأت نہیں ہوتی، کٹر سے کٹر
دشمن بھی امانت رکھنے کے لئے اُسی کے دروازے پر آتا ہے، اُسی پر بھروسہ کرتا ہے

یہی امانت کی صفت تھی جس نے مکہ کی دولت مند ـــ تاجرہ خدیجہ کبریٰ
کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مائل کیا۔

عرب کی وہ سوداگر خاتون جس کا تجارتی قافلہ تنہا تمام قریش کے
تجارتی قافلوں کے برابر مال تجارت لے کر باہر جاتا وہ اس ہاشمی سوداگر سے
درخواست کرتی ہیں ـــــ آپ میرا مالِ تجارت لے کر شام تشریف لے جائیے

بڑے بڑے سوداگر تمنا کرتے کہ خدیجہ ہمیں مال تجارت دے کر باہر بھیجیں
اور خدیجہ تمنا کرتی ہیں کہ "محمد" میرا مال لے کر باہر جانا منظور فرمالیں۔

اس نوجوان سوداگر کے حسنِ معاملہ کی وجہ سے خدیجہ کبریٰ کے علاوہ بھی
لوگ اپنا سرمایہ اس کے سپرد کر دیتے ـ اور منافع میں شریک رہتے۔

بندگانِ الٰہی کے عام حقوق کی حفاظت امانت داری کی سخت ترین آزمائش
بندگان الٰہی کے عام حقوق کی امانت امانت داری کی سخت ترین آزمائش
کا وہ مرحلہ ہے جہاں کمزور انسانوں کے حقوق کی امانت ادا کرنے کا سوال
سامنے آتا ہے۔

رسول پاک نے اس موقعہ پر بھی امانت داری کا ثبوت پیش کیا ہے اس کی
مثال ایک رسول برحق کے سوا کسی کی زندگی میں ملنی مشکل ہے۔

ایک پڑوسی کے حق کی امانت، ایک غیر مُسلم شہری کے حق کی امانت، ایک دشمن کے حق کی امانت، بیوی بچوں اور عزیزوں کے حقوق کی امانت، رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن امانتوں کو جس طرح ادا کیا ہے وہ اگلے بابوں میں تفصیل کے ساتھ آپ پڑھیں گے۔

نہ صرف آپ نے بلکہ آپ کے فیض یافتہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے کرسی اقتدار پر بیٹھ کر دوسرے مذہب والوں کے قومی —— سیاسی اور معاشی حقوق کی جس اِنصاف کے ساتھ حفاظت کی ہے وہ انسانی تاریخ کا ایک روشن باب ہے اور جو لوگ اِسلامی حکومت پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں ناواقفیت کی وجہ سے اُن کے لئے درسِ عبرت ہے۔

ایک مِثالی وَاقِعہ

اب اِس "تاجرِ امین" کی امانت داری کا مثالی واقعہ سُنئے:-

مکّہ کی سرزمین خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور آپ کے پیرو حضراتِ صحابۂ کرام کے لئے تنگ ہو چکی ہے، سچی خدا پرستی کے جُرم میں قریش کا ظلم و تشدد اپنی اِنتہا کو پہنچ چکا ہے مکہ کے در و دیوار سے ظلم و ستم کے شعلے بلند ہو رہے ہیں، جوں جوں خدا کی وحدانیت اور اِنسان دوستی کی تعلیم پھیل رہی ہے، ووں ووں خدا کے منکروں کا غیظ و غضب جوش میں آرہا ہے۔

ایک دو سال نہیں پورے تیرہ سال ہو رہے ہیں قریش کو ظلم ڈھاتے

ڈھاتے اور مسلمانوں کو صبر کرتے کرتے۔

رسول برحق نے جب دیکھا کہ دشمنانِ حق کا ظلم اب حد برداشت سے باہر ہو رہا ہے تو آپ نے مسلمانوں کو وطن سے چلے جانے کی اجازت دے دی ہے۔ مسلمان صبر و تحمل کی اعلیٰ مثال قائم کر کے گھر بار چھوڑ کر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں، آہستہ آہستہ تمام صحابہ جا چکے ہیں اور اب صرف رسولِ برحق اور چند مسلمانوں کے علاوہ کوئی باقی نہیں رہا۔

قریش نے دیکھا دینِ برحق کی تحریک مدینہ طیبہ میں خوب پھل پھول رہی ہے اور مسلمان وہاں طاقت پکڑتے جا رہے ہیں اس لئے انھوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ قریش کے تمام سرداروں نے جمع ہو کر اس پر غور کیا کہ مسلمان تو ہمارے قبضے سے نکل گئے اور مدینہ جا کر انہوں نے دینِ حق کی تبلیغ شروع کر دی۔ اب اگر محمد بھی ہمارے ہاتھ سے نکل گئے تو سارا کام خراب ہو جائے گا۔

اس پر مختلف تجویزیں پیش ہوئیں کسی نے کہا کہ محمد کو زنجیروں میں جکڑ کر قید کر دیا جائے، کسی نے کہا جلا وطن کر دینا کافی ہے۔

ابوجہل نے تجویز پیش کی کہ ہر خاندان سے ایک شخص کا انتخاب کیا جائے پھر یہ تمام منتخب افراد ایک ساتھ مل کر محمد پر حملہ کر کے اُسے قتل کر دیں، اس طرح محمد کا خون بہا تمام خاندانوں پر تقسیم ہو جائے گا اور خاندانِ ہاشم کو یہ جرأت نہ ہوگی کہ تمام خاندانوں کا وہ مقابلہ کرے، اس تجویز پر سب کا اتفاق ہو گیا۔

اِدھر دشمنوں نے داعی برحق کو قتل کرنے کا پروگرام بنایا اُدھر خدا تعالیٰ نے رسول کو آگاہ فرما دیا اور ہجرت کرنے کا حکم دیدیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضؓ کو ہجرت کی تیاری کا حکم دیا۔ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کو ہدایت فرمائی کہ میں آج رات کو مکّہ سے جا رہا ہوں تم میرے بستر پر سو جانا اور میرے پاس لوگوں کی جو امانتیں رکھی ہوئی ہیں وہ واپس کر کے مدینہ چلے آنا۔

حضورؐ کو اِس بات کا اندازہ تھا کہ قریش مجھے قتل کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں یہ لوگ جب پروگرام کے مطابق گھر میں گھسیں گے تو ہو سکتا ہے جسے یہ لوگ میری جگہ پائیں اُسے قتل کر دیں اِس اندیشہ کے باوجود حضور نے حیدر کرار کی قیمتی جان کو اِس خطرہ کے لئے پیش کر دیا حضرت علی بھی اِس خطرہ کو سمجھ رہے تھے لیکن وہ بھی اپنے محبوب بھائی کی ساکھ پر اپنی جان قربان کرنے کے لئے آمادہ تھے، بڑے سے بڑا نقصان گوارا تھا مگر دشمنوں کے ساتھ خیانت کرنا گوارا نہ تھا وہ دشمن جنہوں نے جسمانی تکلیفیں پہنچانے میں اپنی ساری تدبیریں ختم کر دی تھیں، تمام قوتیں صرف کر دی تھیں، نیز وہ دشمن جو مسلمانوں کو مالی نقصان پہنچانے میں بھی راحت محسوس کرتے تھے، مسلمان کاریگروں سے کام کراتے تھے اور انھیں اُجرت نہیں دیتے تھے۔

جو شخص مسلمان ہو جاتا تھا اُس کی اقتصادی خوش حالی تباہ کرنے کے درپے ہو جاتے تھے، اس کا معاشی بائیکاٹ کرتے تھے، اگر اس کی رقم دینی ہوتی تھی وہ رقم دبا لیتے تھے۔

حضرت خباب رضی اللہ عنہ لوہے کا کام کرتے تھے، اِن کی ایک شخص پر رقم واجب تھی مسلمان ہونے کے بعد جب یہ اِس سے اپنی رقم لینے گئے تو اس نے کہا۔

خباب ! تم قیامت کو مانتے ہو، بس قیامت ہی کے دن اپنی مزدوری لے لینا۔
ایسے دشمنوں کے ساتھ بھی ایماندار رہنا۔ ان کے ساتھ ایک پیسے کی بھی خیانت نہ کرنا، ان کے مالوں کی حفاظت کرنا، جو دشمن مسلمانوں کو گھروں سے بے گھر کر رہے تھے، زمینوں سے بے دخل کر رہے تھے صرف اِس گناہ میں کہ وہ خدا کی بندگی میں بے جان پتھروں اور چاند اور سورج کو شامل کرنا نہیں چاہتے تھے اور مخلوق کے سامنے جھک کر انسانی عظمت پر بٹہ لگانے کو تیار نہ تھے۔

اِنسانی تاریخ سے پوچھو۔! کیا اس کے صفحات میں ایسے ایماندار انسانوں کا نشان موجود ہے جو اِس قسم کے بے ایمانوں کے ساتھ دیانت داری برتتے ہوں، ڈاکوؤں کے مال کی حفاظت کرتے ہوں، اپنا مال چھنتا ہوا دیکھتے ہوں مگر خود اُن چھیننے والوں کا ایک پیسہ نہ مارتے ہوں، حالانکہ اگر چاہتے تو دشمنوں کی رکھی ہوئی امانتوں کو ہضم کر لیتے ——— لیکن وہ "امین" تھے، امانت اور دیانت اِن کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی وہ امانت اور دیانت کی مردہ قدروں کو زندہ کرنے آئے تھے اور یہ کام بے مثال قربانیوں کے بغیر انجام نہیں پاسکتا تھا

اچھا اب آگے بڑھیے

اَمانتداری کا بے مثال واقعہ

اور اِس رسولِ امین کی زندگی کا وہ روشن باب پڑھیے جس میں اِس مقدس انسان کی فاتحانہ خوش بختیوں کا تذکرہ ہے

مکہ فتح ہو چکا ہے، کل کے ظالم آج مقہور و مغلوب ہیں، کل کے زور آور آج بے بس اور بے کس اِس فاتح عرب کے روبرو کھڑے ہیں۔

عثمان بن ابی طلحہ رضؓ کعبہ کے کلید بردار ہیں۔ کعبہ کی کنجی اُنہی کے پاس رہا کرتی تھی یہ بھی اس وقت مفتوح دشمن اور جنگی قیدی کی طرح سامنے ہیں

یہ عثمان مخالفت کے زمانے میں ایک نہایت تکلیف دہ گستاخی کر چکے تھے ایک دن خدا کے سچے عبادت گزار بندے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن سے درخواست کی کہ ـــــ "مجھے میرے دادا ابراہیم علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام کے گھر کی زیارت کرا دو"۔ عثمان نے اِس درخواست کو نہایت سختی سے رد کر دیا۔ حضور نے فرمایا۔

عثمان ـــ! ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ یہ کنجی میرے قبضے میں ہوگی اور ہم اپنے اختیار سے جسے چاہیں گے یہ کنجی دیں گے۔

عثمان بولے۔ "محمد" ـــ! شاید اس دن تک سارے قریش مر چکے ہوں گے

آپ نے فرمایا۔ نہیں وہ دن قریش کی عزّت و عظمت کا دن ہوگا۔

آج وہ دن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق حقیقت بن کر سامنے آچکا ہے۔

حضرتِ علی کرم اللہ وجہہٗ اپنے آقا کے پاس آتے ہیں عرض کرتے ہیں، حضور ـــ! کعبہ کی کنجی ہمیں عنایت فرما دیجئے۔ ـــــ بنی ہاشم کے دوسرے بزرگ بھی زور لگاتے ہیں کہ کنجی ہمیں دے دیجائے ـــ

سقایہ یعنی زمزم کے پانی کی تقسیم کا منصب تو حضرت عباس کے پاس تھا ہی۔ حضور اگر کنجی بھی انہیں مرحمت فرما دیتے تو یہ منصب بھی بنی ہاشم میں چلا جاتا آج مکمل اقتدار حضور کے ہاتھ میں ہے جسے جو منصب چاہیں عنایت فرما دیں۔

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کی سن کر فرمایا۔۔۔ عثمانؓ کہاں ہیں۔؟
عثمان حاضر ہوئے۔ فرمایا۔ عثمان۔۔۔! لو کعبہ کی کنجی لو۔ یہ منصب
ہمیشہ تمہاری اولاد میں رہے گا، اگر کوئی شخص تم سے یہ منصب چھینے گا وہ ظالم
ہوگا۔۔۔ عثمان کنجی لے کر جانے لگے۔ حضور نے پھر بلایا۔ فرمایا۔
عثمان۔! وہ واقعہ تمھیں یاد ہے۔؟۔۔۔ عرض کیا۔ سرکار ہاں یاد ہے
خدا کی قسم آپ بے شک خدا کے سچے رسول ہیں۔ اِس موقعہ خدا تعالیٰ نے یہ حکم
نازل فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا ط
خدا تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو اُن کے مالکوں کے حوالے کر دو۔

یہ تنبیہ اُن مسلمانوں کے لئے اُتری جو حضور سے کعبہ کی کنجی خود لینا
چاہتے تھے۔ قرآن نے یہ بتایا کہ مسلمان صرف امین بنایا گیا ہے اُس کا کام
لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرنا ہے، کمزوروں کو پیسنا اور بے کسوں کو فنا کرنا
نہیں۔ طاقتوروں سے اُن کو بچانا ہے۔ خدا کی زمین پر انصاف قائم کرنا ہے
یہ ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت داری، ایمانداری جس نے
آپ کی سیرتِ پاک کو تمام اِنسانی برادری کے لئے قابل تقلید نمونہ بنا دیا ہے۔

حضور کا پیغام

رسولِ امین کی سیرت کے اِس اہم حصہ کے ساتھ اگر آپ کے پیغامات کو بھی
پیش نظر رکھا جائے تو امانت کے تمام اجزا پوری ہمہ گیری کے ساتھ واضح ہو جاتے
ہیں اور اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جس صفت پاک سے حضورؐ کی سیرت

متصف تھی آپ نے اس صفت کو اپنے متبعین کے لئے کتنا اہم قرار دیا۔

اِس پیغام سے یہ بات بھی واضح ہوجائے گی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں اور دوستوں سب کے ساتھ امانتداری کا برتاؤ محض سیاسی پروپیگنڈے کے طور پر نہیں کیا بلکہ ایک سچے ہادی کی طرح امانت کو زندگی کا بنیادی اصول قرار دے کر خود بھی اسے اپنایا اور دنیا کو بھی اس کی تلقین فرمائی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اپنے خطبوں میں ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

لا ایمان لمن لا امانۃ لہٗ — جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں

ایک موقعہ پر آپ نے آسمان و زمین کی قسم کھا کر فرمایا۔

کسی بندے کا اُس وقت تک دین درست نہوگا، جب تک کہ اس کی زبان درست نہ ہوگی اور زبان درست نہوگی جب تک کہ اُس کا دِل درست نہ ہوگا اور جو شخص ناجائز طریقے سے کسی کا مال حاصل کرے گا اور اس میں خرچ کرے گا تو اس میں برکت نہیں دیجائے گی اور اگر اس میں سے خیرات کرے گا تو وہ قبول نہیں کی جائے گی

امانت کا ایک نہایت لطیف موقعہ واضح فرماتے ہوئے فرمایا۔

المجالس بالامانۃ — مجلسیں امانت کے ساتھ ہوتی ہیں

یعنی کسی مجلس میں جو باتیں ہوتی ہیں وہ امانت ہوتی ہیں، ان باتوں کو دوسری جگہ نقل کرنا، اگر اِس سے کسی قسم کا جھگڑا ہوتا ہو — یا۔ کسی کا حق تلف ہوتا ہو تو یہ خیانت ہے، جو بات جہاں سنو اس کو وہیں رہنے دو، ادھر کی اُدھر کرنا امانت کے خلاف ہے۔ امانت کی برکت ظاہر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

اَلاَمانۃ تجرُّ الرِّزقَ والخیانۃ تجرُّ الفقرَ

امانت داری رزق کو بڑھاتی ہے اور بے ایمانی اور خیانت غربت وافلاس لاتی ہے۔

کیا اس پیغمبر کے سوا کسی ہادی اور رہنما کی عملی سیرت اور اس کا پیغام اتنا ہمہ گیر، اتنا انسانیت نواز، اتنا امن پرور ہے جس پر انسانیت فخر کر سکے اور ساری اولاد آدم علیہ السّلام اس پر چل کر کامیابی کی منزل مقصود حاصل کر سکے

صلی اللہ علیہ وسلم

دیانتدار سوداگر کی حیثیت سے

آیئے۔! اب ایک بد معاملہ قوم میں ایک مثالی دیانتدار سوداگر کو دیکھیں یہ بد دیانتی اور حقوق تلفی کے اندھیرے میں ایمانداری اور سچائی کا چراغ کون جلا رہا ہے۔؟ یہ کس نے اپنی معاملہ داری سے ساری قوم کا اعتماد حاصل کر رکھا ہے۔؟۔ یہ وہی ہاشمی نوجوان ہے جس کو تمام قوم "امین" یعنی امانتدار کہہ کر پکارتی ہے، یہ۔ عہد کا پکّا ہے، وعدہ کا سچا ہے اور قول کا پورا ہے، اب ہر شخص اس کے پاس اپنی قیمتی امانتیں رکھواتا ہے، بوڑھے سرداروں میں ابو جہل ہے، عباس رض ہیں، ابو سفیان رض ہیں، ابو طالب اور ابو لہب ہیں مگر اس نوجوان کی ساکھ کے مقابلہ میں کسی کا چراغ نہیں جل رہا۔

سوداگری کے زمانے میں عبد اللہ بن ابی الحمساء نے ایک دفعہ اس سوداگر سے معاملہ کیا۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

کچھ معاملہ ہو چکا تھا، کچھ باقی تھا۔ میں نے وعدہ کیا پھر آؤں گا۔ اتفاق کی بات مجھے تین دن تک اپنا وعدہ یاد نہ آیا، تیسرے دن جب میں موقعہ پر پہنچا تو دیکھا کہ وہ سوداگر اسی جگہ میرا منتظر ہے۔

اِس وعدہ خلافی کی وجہ سے اس کو بگڑنا چاہیئے تھا مگر وہ بالکل ناراض نہ ہوا اُس نے صرف اتنا کہا ۔۔۔ "عبد اللہ ۔۔! تم نے مجھے تکلیف دی، میں اِسی جگہ تین دن سے موجود ہوں۔ (ابوداؤد جلد ۲ صہ ۳۳۴)

یہ ایک معاملہ دار سوداگر کی حیثیت سے فخرِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیرکٹر ہے۔ ٹھیک ہے، وہ اگر رسول کی حیثیت سے رسالت کے مکمل اوصاف کے مالک تھے تو ایک بلند کیرکٹر اور امانت دار تاجر کی حیثیت سے بھی اپنی قوم میں ممتاز تھے۔

حضرتِ سائب رضی اللہ عنہ سے بھی معلوم کرلو ۔۔! انھوں نے بھی نبی بننے سے پہلے سوداگری کی زندگی میں سرکارِ دو عالم سے معاملہ کیا ہے، اِسلام قبول کرکے جب سائب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو لوگوں نے حضور سے سائب کی تعریف کی ۔۔۔ کہ یہ بڑے اچھے آدمی ہیں، ۔۔ حضور نے سنکر فرمایا۔ "سائب کو میں تم سے زیادہ جانتا ہوں"۔ سائب نے عرض کیا۔

۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ میرے ساتھ تجارت میں شریک ہوکر کام کرچکے ہیں۔ میں نے آپ کو لین دین کا ہمیشہ صاف پایا، نہ آپ جھگڑا کرتے تھے، نہ لوگوں سے بلاوجہ اُلجھتے تھے۔ (ابوداؤد جلد ۲ صہ ۳۱۷)

غور کرو ۔! اس باکمال سوداگر نے لین دین اور خرید و فروخت کے میدان میں ایمانداری کی یہ کیسی مثال قائم کی ہے، لوگ سمجھتے ہیں، جھوٹ اور دھوکہ کامیاب تجارت کا راز ہے لیکن اس شخص نے ایمانداری سے نفع حاصل کرکے حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے مال کو دوگنا تگنا کردیا ہے۔

دیکھنے والے حیرت میں ہیں۔۔ خدیجۃ الکبریٰ اِس ایماندار سوداگر کو اپنی زندگی کا مالک بنانے کا فیصلہ کر رہی ہیں،۔۔ یقیناً خدیجہ جیسی باوقار خاتون کو اِس نوجوان سے زیادہ کوئی معاملہ کا صاف اور امانت کا پکا نہیں مل سکتا تھا

یہ کل کے ایماندار سوداگر آج کے نبی ہیں۔۔ یہ اُمّت کو نصیحت فرما رہے ہیں۔ کہ صرف ذکر و شغل اور تہجد گزاری کو ولایت نہ سمجھو۔ بلکہ۔

التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین الحدیث	جو تاجر دوکاندار سچائی اور ایمانداری سے تجارت کرتا ہے اس کا حشر قیامت میں رسولوں، صدیقوں، شہیدوں اور اور نیک بندوں کے ساتھ ہوگا۔

کتنی بڑی فضیلت ہے ایک ایماندار دوکاندار کی۔۔؟ اور کتنی سخت ناراضگی اور خفگی ہے ایک بے ایمان اور دھوکے باز تاجر پر۔ کہ اعلان فرما رہے ہیں۔

من غشنا فلیس منا الحدیث	جو مسلمان لین دین میں دھوکے بازی سے کام لے وہ میرا نہیں ہے

حضور "شریف بیٹے" کی حیثیت سے

قدرت کو یہ منظور تھا کہ اپنے آخری رسول ﷺ کو تمام ظاہری سہاروں سے بے سہارا کر کے کھڑا کرے، تعلیم و تربیت کے لیے مشفق استاد کا سہارا نہ ہو۔ جاں نثار ماں باپ کا سہارا نہ ہو۔ دماغی تفریح و مسرت کے لئے کشمیر جیسا پُر فضا

ماحول کا سہارا نہو۔ وہ استاد کی تعلیم کے بغیر بہترین عالم ہو۔ عرب کے جھلسے ہوئے پہاڑی علاقے میں پل کر بھی اُس کا دماغ بہترین دماغ ہو ۔۔۔ تاکہ جو ذات کائناتِ عالم کی محسن بنا کر بھیجی گئی تھی وہ خود کسی مخلوق کے سامنے شرمندۂ احسان نہ ہو اور دنیا کو یہ کہنے کا موقعہ نہ ملے کہ کائناتِ ہستی کی یہ عظیم شخصیت کسی ظاہری سبب کی پیداوار ہے۔

اسی وجہ سے دیکھو ۔۔! وہ خلّاقِ عالم کی مقدس امانت شکمِ آمنہ میں تھی کہ والد ماجد جناب عبد اللہ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، والد کے انتقال کے دو ماہ بعد کو نہیں یہ دولت بی بی آمنہ کی گود میں آئی، پھر رضاعت (دودھ پلانے) کے بہانے چمنستانِ رسالت کے اس سدا بہار پھول نے قبیلۂ بنی سعد کو مہکایا اور بی بی حلیمہ کی قسمت کا ستارہ چمکا۔

ایک یتیم بچے کی تعلیم و تربیت کے لیے گو صرف ماں کا سہارا کوئی سہارا نہیں مگر غیرتِ الٰہی نے اس سہارے کو بھی برداشت نہ کیا اور ماں کے سایے سے بھی آپ کو بے سہارا کر دیا۔ اُس وقت حضور چھ[۶] سال کے تھے۔

بی بی آمنہ کے بعد دو سال دادا کی سرپرستی میں رہے، پھر دادا بھی انتقال فرما گئے۔ اب یہ دولت پھوپی اُمّ ایمن اور چچا ابو طالب کی ظلِّ عاطفت میں آئی اور اُنھوں نے اِس دُرِّ یتیم کی خدمت کر کے بقدر قسمت سعادت حاصل کی۔

آپ کہیں گے کہ جب "ربّ محمد" صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ منظور تھا کہ اس کا محبوب تمام سہاروں سے بے نیاز ہو کر کھڑا ہو تو پھر اُس نے ماں، دادا، پھوپی اور

چچا کی اس تھوڑی سی رفاقت کو بھی اپنے نبی کے لئے کیوں گوارا کیا ـــــ ؟

میں کہوں گا ـــــ قدرت کو جہاں اپنے دُرِ یتیم کو ظاہری سہاروں سے بے نیاز رکھنا تھا وہاں اُس کامل نبی کی زندگی میں ایک شریف بیٹے کا اُسوہ بھی قائم کرنا تھا اور ایک سعادتمند بیٹے کا نمونہ رسول اعظم کی زندگی میں تب ہی ظاہر ہو سکتا تھا جب بطور اولاد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے آغوش میں پلتے اور پھر جوان ہو کر اُن کے حسنِ سلوک کا اچھا حق ادا کرتے۔

اسی حق کی ادائیگی سے ایک شریف بیٹے کی زندگی کا نمونہ قائم ہوتا ہے، اب اس مکمل زندگی کے نمونہ میں سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ماں باپ کے مرنے کے بعد اولاد پر ماں باپ کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ وہ اُن کے لئے دعاء مغفرت کرے چنانچہ فخر انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے والدین کے لئے دُعاء مغفرت فرمائی، صحابۂ کرام بیان کرتے ہیں۔

حضور کے ساتھ ایک ہزار کے قریب صحابہ تھے، مکہ اور مدینہ کے درمیان جب ہم اُس مقام پر پہنچے جہاں حضور کی والدہ ماجدہ حضرتِ آمنہ مدفون تھیں تو آپ نے صحابہ سے فرمایا ـــــ تم عقبہ کے پاس ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔ آپ کچھ دُور جا کر ایک قبر کے پاس کھڑے ہو گئے ـــــ

فنزل علیٰ قبرٍ ـــــ فجلس علی قبرٍ ـــــ

اور دُعا کرنی شروع کی، دُعا کرتے وقت آپ پر رقت طاری ہو گئی اور رونے کی دبی دبی اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز نے ہمیں بھی بے قرار کر دیا اور ہم رونے لگے، ہمارے رونے کی آواز سنکر حضور فوراً تشریف لائے اور صحابہ سے پوچھا۔

تم لوگ اس قدر کیوں رو رہے ہو ـــــــــ ؟۔ صحابہ نے عرض کیا۔ حضور!
آپ کی گریہ وزاری نے ہمیں بے اختیار رونے پر مجبور کر دیا۔ ہمیں یہ خیال ہوا کہ
شاید خدا کی طرف سے اُمت کے لئے کوئی سخت حکم نازل ہوا ہے۔ آپ نے ارشاد
فرمایا ـــــــ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ واقعہ یہ ہُوا کہ جب میں اس مقام
پر پہنچا تو مجھے اپنی والدہ کی قبر کا خیال آیا۔ میں قبر پر پہنچا اور اپنی ماں کے لئے
دعا مانگی، خدا تعالےٰ نے اُنھیں دوبارہ زندگی عطا فرمائی اور وہ مجھ پر ایمان لائیں۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے میرے والد کو بھی دوبارہ زندہ فرمایا
اور وہ بھی مجھ پر ایمان لائے۔

محدثین فرماتے ہیں۔ یہ زندگی اس طرح کی تھی جس طرح حضور اقدس ص
کی دعا سے خدا تعالیٰ نے ڈوبتے سورج کو دوبارہ لوٹا دیا تھا اور آپ نے
عصر کی نماز ادا فرمائی تھی۔ (حافظ ابن کثیر سورہ توبہ صفہ ۳۹۳)

حضور کے چچا ابو طالب کے بارے میں آتا ہے کہ ایک دفعہ جب بیمار پڑے
تو حضور مزاج پرسی کے لئے اندر تشریف لے گئے، بھتیجے کو دیکھ ابو طالب بولے
بیٹا۔! کیا خالی مزاج پرسی کرنے آئے ہو، جس خدا نے تمھیں رسول بنایا ہے۔
اُس سے میری تندرستی کے لئے دُعا کیوں نہیں کرتے۔؟
بیٹے نے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ رحمتِ الٰہی کو بھی جوش آگیا، دُعا
قبول ہوئی، ابو طالب کے کانٹا سا نکل گیا۔ تندرست ہو گئے، اُٹھ کر بیٹھے، محبت کے
جوش میں بولے،۔ بیٹا۔! خدا تمہارا کہنا مانتا ہے۔ آپ نے تبلیغ کا ایک اچھا موقعہ
پاکر ارشاد فرمایا۔

چچا جان۔ ! اگر آپ بھی اپنے خدا کا کہنا مان لیں تو خدا تعالیٰ آپ کا بھی کہنا ماننے لگے۔ (سیرت النبی جلد اوّل)

ابو طالب زندگی بھر ایمان نہ لائے، حضور کے محسن اور جاں نثار چچا تھے جب چچا کا وقت قریب آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کے قریب آ کر بیٹھ گئے اور ارشاد فرمایا — لا الٰہ الا اللہ — کا اقرار کر لیجیے۔ تاکہ میں خدا کے پاس آپ کے ایمان کی شہادت دے سکوں۔"

دِل کی نصیحت تھی کارگر ثابت ہوئی، جب ابو طالب مرنے لگے تو لوگوں نے دیکھا۔ ابو طالب کے لب ہل رہے ہیں، اُن کے بھائی حضرت عباسؓ پاس ہی کھڑے تھے، بھائی کے مُنھ کے قریب کان لگا کر کچھ سُنا۔ حضور کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "۔ بھتیجے تم نے جو کلمہ ابو طالب کے سامنے پیش کیا تھا، ابو طالب وہی کلمہ پڑھ رہے ہیں۔

(نوٹ :۔ حضرت عباسؓ کا یہ جملہ سیرت ابن ہشام صـ۱۴۶ میں ہے)

راقم نے حضور کے والدین اور آپ کے چچا کے ایمان و کفر کے اختلافی مسئلہ میں ایمان کے پہلو کی روایات کو اختیار کیا ہے کیونکہ اس پہلو کو جہاں علماء اہل سنّت کے بڑے گروہ نے قابل ترجیح سمجھا ہے وہاں اِن تینوں بزرگوں کو سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے جو نسبت حاصل ہے ——— اس کا تقاضہ ہے۔ اور جن علماء نے اس مسئلہ میں بھی روایات کی قوت و کمزوری پر نظر رکھنا ضروری خیال کیا ہے وہ بھی "سکوت" کو اولیٰ قرار دیتے ہیں اور کفر کی تشہیر کو خلاف ادب سمجھتے ہیں۔

سورۂ توبہ کی مندرجہ ذیل آیۃ کی تشریح جو علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے اُس سے اور تفسیر ابن کثیر صفحہ ۳۱۰ جلد ۲ کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو سکتی ہے، آیت یہ ہے۔

ماکان للنبیّ والذین آمنوا ان یستغفروا الخ (سورہ توبہ)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رضاعی ماں حلیمہ سے بھی بہت محبت فرماتے تھے، نبوت کے بعد حضرت حلیمہ اپنے بیٹے سے ملنے آئیں تو حضور اپنی ماں کو دیکھ کر پھڑک اُٹھے اور "میری ماں" "میری ماں" کہہ کر حضرتِ حلیمہ سے لپٹ گئے۔ حضرت حلیمہ نے بعد میں اسلام قبول کیا۔

اِسی طرح جب آپ کے رضاعی باپ حضرتِ حارث آپ سے ملنے آئے تو آپ نے اُنھیں دیکھ کر اپنی مبارک چادر اُن کے لئے زمین پر بچھا دی اور جب اُنھوں نے قیامت کے متعلق پوچھا "بیٹا کیا بات صحیح ہے کہ مرنے کے بعد پھر زندہ ہونا ہے۔؟ آپ نے فرمایا۔

ابا جان! جس دن قیامت قائم ہوگی، اُس دن میں آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو بتاؤں گا، اباجان۔! دیکھو قیامت قائم ہوگئی ہے۔

حضرتِ حارث رضؓ اِس کو بڑے والہانہ انداز سے بیان کیا کرتے تھے۔ میرا بیٹا۔ جب قیامت کے دن میرا ہاتھ پکڑے گا تو مجھے یقین ہے کہ وہ جنت سے درے نہیں چھوڑے گا۔

یہ ہے اُس شریف بیٹے کا اُسوۂ پاک

اُمت کے لئے جو ہدایات اُس رسولِ برحق نے دیں اُن کا خلاصہ معراج کے

احکام میں اس طرح ہے ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ — اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اُس کے سوا کسی کو نہ پوجو۔

۲۔ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ اَوْ کِلٰھُمَا فَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْھَرْھُمَا وَقُلْ لَّھُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا وَاخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَۃِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْھُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا۔

اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا اور جب ـــــ ماں باپ تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچیں تو اُن کو "ہوں" بھی نہ کہنا اور نہ ان پر خفا ہونا اور ان سے ادب سے بولنا اور ان کے سامنے اطاعت کا بازو جھکانا اور اُن کے حق میں دُعا کرنا، ـــ کہ میرے پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے مجھے بچپن میں پالا ہے۔

حضورؐ اچھے باپ کی حیثیت سے

ایک اچھے باپ میں دو باتیں ہونی ضروری ہیں۔

۱ـــ یہ کہ وہ اپنی اولاد سے محبت کرتا ہو

۲ـــ یہ کہ محبت کے ساتھ اُن کی تعلیم و تربیت کا پورا خیال رکھے۔

مدنی آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پاک ایک اچھے باپ کا بہترین نمونہ ہے اولاد کے ساتھ محبت و شفقت کا یہ حال ہے کہ ایک روز رات کو سیدہ زہرا

کے گھر تشریف لے گئے، دیکھا تو اسے رو رہے ہیں اور بیٹی، داماد ـــ دن بھر کے تھکے ہارے آرام سے سو رہے ہیں، کوئی دوسرا ہوتا تو بیٹی کو جگاتا مگر آپ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے بکری کا دودھ نکالا اور نواسوں کو پلایا، بچوں کو بہلانے کے لئے نہ بیٹی کو جگایا نہ اپنے داماد حضرت علی رض کو ـــ چھوٹی بیٹی سے اس قدر محبت تھی کہ روزانہ عشار کی نماز سے فارغ ہو کر ـــــــــــــــ

حضرتِ سیدہ کے گھر تشریف لے جاتے ہیں اور انھیں دیکھ کر گھر واپس آتے ہیں۔

حضرتِ ابراہیم جب وفات پا جاتے ہیں تو بیٹے کی جدائی پر روتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں ـــ ابراہیم۔! تمہاری جدائی نے ہمیں مغموم کر دیا، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم صبر و استقلال کے اس پیکر عظیم کو روتا دیکھ کر کہتے ہیں یا رسول اللہ ـــ یہ آنسو کیسے ـــ؟ آپ تو ہمیں صبر کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔

جواب میں ارشاد فرماتے ہیں ـــ مصیبت پر رونا قلب کی نرمی کی علامت ہے۔ صبر کے خلاف یہ ہے کہ انسان چیخے چلائے اور گریبان چاک کرے

دنیا کی جہالت کا یہ حال ہے کہ لڑکی کے وجود کو باعثِ عار سمجھتے ہیں، اور اس کی پیدائش کو موجب ذلّت مگر رسول برحق جو قوم میں سب سے زیادہ عزّت رکھتے ہیں، سب سے زیادہ عظمت والے ہیں، قوم سے فرماتے ہیں۔

تم بیٹیوں کو ناپسند کرتے ہو، مجھے دیکھو، میں بیٹیوں کا باپ ہوں میرے ہاں کوئی بیٹا نہیں ہے مگر اس سے نہ میری عزّت میں کوئی فرق آیا، نہ میری عظمت میں۔ اگر بیٹیوں کے ہونے سے ماں باپ کی عزت خراب ہوتی تو محمد ﷺ سب سے پہلے بیٹی سے نفرت کرتے مگر وہ محبّت کرتے ہیں،

کتنا اچھا باپ ہے جس نے دنیا میں اس مظلوم صنف کی عزت بڑھائی،
ستم رسیدہ بیٹیوں کو بیٹوں کے برابر لا کھڑا کیا۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا۔
عورت کی برکتوں میں سے یہ بھی ایک برکت ہے کہ وہ سب سے پہلے
لڑکی جنے [۱]

کیا اس سے زیادہ اچھا باپ آج تک دنیا نے دیکھا ہے، صلی اللہ علیہ وسلم۔
اس محبت کے ساتھ اولاد کی تربیت و تعلیم کا اتنا خیال تھا کہ ایک موقعہ پر
حضرت زہراؓ سے ارشاد فرمایا۔ فاطمہ عمل کر، عمل کر، مجھ سے جو کچھ لینا ہے
دنیا میں لے لے، قیامت کے دن میں تیرے کچھ کام نہیں آؤں گا۔
دونوں جہاں کے سردار ہیں، قیامت میں آپ کی شفاعت سے امت
کے گنہگاروں کا بیڑا پار ہوگا مگر دیکھو، لخت جگر کو کس سختی سے تنبیہ فرما
رہے ہیں، عمل کا شوق دلا رہے ہیں، بڑے لوگوں کی اولاد جس گھمنڈ سے تباہ
ہوتی ہے اس گھمنڈ کو توڑ رہے ہیں۔
آپ نے اپنی اولاد کو نمود و نمائش سے دُور رکھا، نہ بیویوں کو زیور
پہننے دیا نہ بیٹیوں کو۔
اس لئے سمجھدار لوگ کہتے ہیں، اولاد کو کھلائے سونے کا نوالا اور
دیکھے قہر کی نگاہ۔
فاطمہؓ مخزومی رضی اللہ عنہا کے لواحقین نے جب حضرت اسامہؓ سے

---

[۱] تفسیر روح البیان سورہ نحل رکوع ۸

سفارش کرائی کہ عورت ذات ہے ۔ حضور ۔! اگر چوری کی سزا میں، اس کے ہاتھ کٹوائیں گے تو ان ہمارے قبیلے کی بدنامی ہو گی ۔ یہ سنکر آپ نے فرمایا ۔

"خدا کی قسم ۔! اس فاطمہ کی جگہ اگر فاطمہ بنت محمد بھی ہوتی تب بھی میں اس کا ہاتھ کٹواتا ۔"

اپنی اولاد کو تنبیہ کرنے کا کتنا اچھی طریقہ ہے ۔

اس اسوۂ پاک میں حضور نے امت کو جو تعلیم دی اس میں بھی ماں باپ کی اخلاقی ذمہ داری کی پوری وضاحت کی ہے، آپ نے ارشاد فرمایا ہے ۔

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّ رَاعٍ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ فَالْإِمَامُ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالرَّجُلُ فِي أَهْلِهِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا ۔

تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر ذمہ دار اپنی رعایا کے بارے میں جوابدہ ہے ۔ پس امام راعی ہے اور وہ اپنی رعیت کا جوابدہ ہوگا اور مرد اپنے اہل کا راعی ہے وہ اس کے بارے میں جوابدہ ہے اور عورت اپنے شوہر کے گھر کی راعی ہے اور اپنی متعلقہ رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے ۔

(رواہ البخاری ومسلم)

یعنی تم صرف اپنی نماز اور روزے کی وجہ سے نجات نہیں پاؤ گے جبتک بادشاہ اپنی رعیت کو، ماں باپ اپنی اولاد کو اور شوہر اپنی بیوی کو سدھارنے اور صحیح راہ پر چلانے کی کوشش نہ کرے گا، جن ماں باپوں کی اولاد ان کی غفلت سے خراب ہو جائے گی وہ باوجود نماز روزے کی پابندی کے خدا کے حضور میں مجرم بن کر کھڑے ہوں گے ۔

بعض روایات کے لحاظ سے خداتعالیٰ نے حضور کو آٹھ بچے عطا فرمائے
قاسم، طیّب، طاہر، ابراہیم، چار بیٹے۔ اور فاطمہ، زینب، رقیہؓ اور
اُمِ کلثوم۔ چار بیٹیاں۔۔
بیٹے تو سبھی چھٹپنے میں خدا کو پیارے ہو گئے، بیٹیاں زندہ رہیں،
پروان چڑھیں اور بیاہی گئیں۔
حضرت ابراہیم کے علاوہ تمام بچے حضرت خدیجہ کبریٰ کے بطن سے
پیدا ہوئے، ابراہیم حضرت ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھے۔
ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش کا جب حضور کو مژدہ سُنایا گیا تو آپ نے
مژدہ سنانے والے غلام کو آزاد کر دیا۔
حضرتِ ابراہیم کو ایک دایہ کے سُپرد کر دیا گیا تھا، یہ ایک غریب لوہار
کی بیوی تھی، اِن کا شوہر گھر ہی لوہے کا کام کرتا تھا جس کی وجہ سے گھر میں
دھواں گھٹا رہتا تھا، حضور اپنے لختِ جگر ابراہیم کو دیکھنے کے لئے روزانہ دایا کے
گھر جایا کرتے تھے، ابراہیم کو گود میں لے کر دیر تک پیار کرتے تھے۔
آپ کی آنکھوں اور ناک میں دھواں گھستا رہتا تھا۔ کیسے نازک طبع تھے
آقا صلی اللہ علیہ وسلم، کچے لہسن، پیاز کی بو سے گھبراتے تھے، ایک بیوی نے
مغافیر کی بُو کا نام لے دیا تو آپ نے شہد کو چھوڑ دیا، مگر اولاد کی محبت کا کیا
حال تھا کہ دھویں سے طبع مقدس ہلکان ہو رہی ہے مگر بچے کو پیار کیا جا رہا ہے
کلیجے سے لگایا جا رہا ہے۔
آپ کو اپنی لڑکیوں سے اِس قدر محبت تھی کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

ہجرت کر کے حبشہ تشریف لے گئے تو اُن کے ساتھ اُن کی حرم محترم حضرتِ رُقیہ بھی تھیں اُن کی جدائی کا آپ پر بے حد اثر تھا، جب تک حضورِ اکرم کو اُن کی خیریت معلوم نہ ہوئی آپ بے چین رہے۔

اِسی دَوران میں حبشہ سے ایک عورت آئی، آپ کو معلوم ہوا تو اُسے فوراً بلوایا۔ اُس نے کہا۔ حُضور! میاں بیوی دونوں خیریت سے ہیں حضور کی بے چینی ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں۔۔ تم اُن دونوں کو دیکھ بھی آئی ہو۔

وہ بولیں ۔۔۔ "ہاں" حضور میں اُن سے مل کر آئی ہوں۔

یہ سُنکر آپ نے فرمایا۔ الحمد للہ۔۔! حضرتِ ابراہیم اور حضرت لوط، کے بعد عثمان پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ہجرت کی۔

حضور کی اولاد میں صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی آخر میں تنہا رہ گئیں تھیں اور حضور کے قریب ہی اُن کا مکان تھا اس لئے یہ اپنے پیارے باپ کی محبتوں کا مرکز تھیں۔

آپ عشار کی نماز پڑھ کر چھوٹی بیٹی کے ہاں تشریف لے جاتے، بیٹی داماد کی خیر خبر لیتے، حضرت فاطمہ رض خود تشریف لاتیں تو حضور کھڑے ہو جاتے، پیشانی پر بوسہ لیتے، اپنی جگہ بٹھاتے۔

چھوٹی بیٹی کے پانچ بچے ہیں، حسن، حسین، محسن، زینب، کُلثوم، محسن بچپن ہی میں اِنتقال فرما گئے تھے۔

بڑی لڑکی زینب کی ایک بچی حیات تھیں، جن کا نام امامہ تھا۔

حُضور ان نواسوں سے بیحد محبت کرتے تھے، کندھوں پر لئے پھرتے تھے

فرماتے تھے یہ "میرے گلدستے ہیں"۔ اولاد کے معاملہ میں آپ حد درجہ دردمند تھے، کسی کے منھ سے اُس کے بچوں کی داستانِ غم سنتے تو تڑپ اُٹھتے
ایک صحابی نے اپنا ایک قصہ سُنایا کہ حضور! میں جاہلیت کے زمانے میں اپنی معصوم بچی کو زندہ دفن کرنے لے گیا۔ جب اُس پر مٹی ڈالنے لگا تو وہ ابا، ابا پکارنے لگی۔

حضور نے یہ قصہ سُنا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا۔ یہ قصہ پھر سُناؤ اُس نے پھر سُنایا۔ دوبارہ قصہ سنکر آپ بے حد روئے یہانتک کہ آپ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔

حضور اچھے شوہر کی حیثیت سے

خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ وَاَنَا خَیْرُکُمْ لِاَھْلِیْ

(بخاری شریف) (تم میں اچھا وہ ہے جو اپنی بیوی کے لئے سب سے اچھا ہو اور میں اپنی بیویوں کے لئے تم سب سے اچھا ہوں، (مفہوم)

ایک اچھے شوہر کی حیثیت سے بھی رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ وہ کامل ترین اسوہ ہے جو خدا کے رسول خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مکمل زندگی کے سوا کسی دوسری زندگی میں نظر نہیں آسکتا۔

آج سے چودہ سو سال پہلے لوٹیے ــــ دیکھیے! دنیا کی نگاہ میں عورت کا

کیا درجہ ہے؟ روما کی تہذیب عورت کو لعنت کہہ رہی ہے، یونان اور فارس کی نگاہ میں عورت مرد کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے، ہندوستان میں عورت مرد کی داسی اور غلام ہے، یورپ کے علماء اس بات پر بحث کر رہے ہیں کہ عورت انسان بھی ہے یا نہیں -؟

مشرق و مغرب کی مذہبی دنیا کا عام خیال ہے کہ مرد و عورت کا ازدواجی رشتہ مرد کی روحانی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

عورت کی مظلومی کے اس بھیانک دور میں قرآنِ حکیم عورت کی عزت و حرمت کا اعلان کرتا ہے اور اس اعلان کو —— سماجی اصلاح کے مکمل قانون کو —— رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عملی زندگی سے ایک حقیقت بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلامی معاشرتی اصلاح کے مکمل دستور کے ساتھ اگر رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کا حسین عملی نقشہ دنیائے انسانیت کے سامنے نہ ہوتا تو صدیوں کی بگڑی ہوئی سوسائٹی عورت کو باعزت درجہ دینے کے لئے اتنی آسانی سے تیار نہ ہوتی۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی گھریلو زندگی کو محبت، وقار اور ایثار و تعاون سے جنت کا حسین نمونہ بنایا، پھر اس خلوت کو دنیا کے سامنے جلوت کی طرح کھول کر رکھا، لوگوں نے اُسے قریب سے دیکھا، وہ دنیا کے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ لوگوں نے اُسے اپنایا، روح کو سکون ملا، دل کو چین نصیب ہوا اور دنیا کو تسلیم کرنا پڑا کہ اسلام نے اچھی معاشرۃ کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ برحق ہے اور انسانی فطرت کی آواز ہے۔

ایک اچھے شوہر کی حیثیت سے رسولِ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ـــــ؟

غور کیجیئے! آپ مکہ کے ۲۵ سالہ حسین نوجوان ہیں، بڑے گھر کے چشم و چراغ ہیں، حسینوں میں آپ کے حُسن و جمال کے چرچے ہوتے ہیں، اگر آپ اِشارہ کر دیں تو مکہ کی اچھے سے اچھی دوشیزہ آپ کی خدمت میں فخر کے ساتھ پیش ہو سکتی ہے، ہر خاندان اِس آرزو میں ہے کہ یہ ہاشمی شاہزادہ ہمیں نواز دے لیکن یہ ہاشمی نوجوان نہ کسی دوشیزہ کا انتخاب کرتا ہے، نہ کسی بڑے گھر کو دیکھتا ہے بلکہ مکہ کی چالیس سالہ خاتون حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ آپ شادی کرتے ہیں اور اس سے وہ دنیا کو سبق دیتے ہیں کہ ـــــ عورت نہ جوانی کا نام ہے، نہ حسن کا، عورت تو عفت و حیا کا نام ہے جس کا زیور محبت و خدمت ہے۔

اس وقت عرب ہی کیا اور ہندوستان میں کیا، بیوہ عورت کی کیا قیمت تھی اور پھر کنوارے مرد کے نزدیک ـ؟ مگر رسولِ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک بیوہ کو اپنے حرم میں داخل کر کے دنیا کو یہ بتا دیا کہ ـــــ عورت ہر حال میں عورت ہے جس کی عزت کسی حالت میں کم نہیں ہوتی ـــــ!

دُنیا یہ سمجھتی تھی اور آج بھی ایسا سمجھنے والے موجود ہیں کہ عورت، مرد کی نفسانی خواہشیں پورا کرنے کی بس ایک جاندار مشین ہے، اس کا حق کیا اور اس کی عزت کیسی ـ؟ روٹی کپڑا دیتا ہے تو ایک غلام کی طرح جسے اُس کا آقا، ہزار احسان رکھ کر روکھی سوکھی کھلا دیتا ہے، لیکن اسلام نے عورت کو عزت دی، عزت کے ساتھ حق دیا اور رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سب سے بڑے انسان اور

سب سے بڑے شوہر کی حیثیت سے اس کا بہترین نمونہ پیش کیا۔

ایک روز حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سرورِ کونین صلی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، درِ دولت کے قریب آئے تو اندر سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات رضؓ کے بولنے کی آواز سنائی دی حضرت عمرؓ فاروق نے اسلامی طریقہ کے مطابق اجازت چاہی، رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفیق جاں کو اندر بلالیا۔

حضرت عمر فاروق اندر گئے، دیکھا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مسکرا رہے ہیں، حضرت عمر فاروق نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مسکراتا ہوا دیکھکر عرض کیا۔ خدا تعالیٰ سرکارؐ کو ہمیشہ ہنستا رکھے، اس وقت ہنسنے کا سبب کیا ہے، رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"عمر" تمہارے آنے سے پہلے ازواجِ مطہرات اپنے گزارہ میں کمی کی شکایت کر رہی تھیں اور یہ مطالبہ کر رہی تھیں کہ گزارہ ـــــــ میں اضافہ کیجیے ـــــــ ـــــــ لیکن عمر ـــ! جب انھوں نے تمہاری آواز سُنی تو دبک دبک کر ایک طرف بیٹھ گئیں، ان کے دبکنے اور ڈرنے سے مجھے ہنسی آگئی۔

عمر۔ ! تمہارا دبدبہ حق بھی ایسا ہے کہ جس راستہ سے تم گزرتے ہو، شیطان اُس راستہ کو چھوڑ بھاگتا ہے،

رسولِ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کتنے بڑے آدمی ہیں، کتنے عزت والے شوہر ہیں مگر بیویوں کو عرب کے دستور کے مطابق دبا کر نہیں رکھتے، انھیں نان نفقہ کے لیے رکھنے سننے کا حق دے رکھا ہے، عرب میں ایک عورت کی کیا مجال تھی

کہ وہ شوہر کے سامنے روٹی کپڑے کے لئے زبان ہلائے مگر حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم بیویوں کی شکایت نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ سن رہے ہیں اور دلجوئی فرما رہے ہیں۔

یہ اُس اعلانِ ربانی کی عملی تفسیر تھی، ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف یعنی عورتوں کا بھی مردوں پر اسی طرح حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے یہ دورِ جہالت ہی کی بات نہیں، بلکہ اِس دورِ تہذیب کی بات بھی ہے کہ گھر میں بیوی بچّوں پر فاقہ ہے اور میاں بازار میں کھاتے پھرتے ہیں، بیوی دال روٹی کو ترس رہی ہے اور میاں میلوں تماشوں میں دونے چاٹتے پھر رہے ہیں۔ رسولِ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بتایا — کہ یہ طریقہ اچھے شوہر کے لئے کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

ایک دفعہ حضور کے ایک ایرانی پڑوسی نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دعوت کی آپ نے ارشاد فرمایا — میرے ساتھ عائشہ رض بھی ہوں گی۔ پڑوسی نے عرض کیا۔ حضور اتنی گنجائش نہیں — تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ تو مجھے بھی منظور نہیں — پڑوسی دوبارہ حاضر ہوا پھر اُس نے دعوت کی اور آپ نے پھر حضرت عائشہ رض کے لئے ارشاد فرمایا۔ اُس نے پھر معذرت کی، آپ نے پھر دعوت نامنظور کردی، وہ پھر واپس چلا گیا، تیسری دفعہ وہ پھر حاضر ہوا، آپ نے پھر ارشاد فرمایا۔ عائشہ رض ساتھ چلیں گی — ! اب کے اُس نے عرض کیا " حضور — ! بخوشی منظور ہے۔

اِس کے بعد دونوں مقدس مہمانوں نے اپنے پڑوسی کے گھر کو عزت بخشی۔

آپ سمجھے یہ بیوی کو ساتھ لے چلنے کے لئے اصرار کیوں تھا ــــ؟
بات یہ تھی کہ شہنشاہ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دولت خانے میں کھانے کے لئے کچھ نہ تھا اس لیے آپ نے کسی طرح اس بات کو مناسب نہ سمجھا کہ خود تو پڑوسی کے ہاں دعوت کھائیں اور بیوی گھر میں بھوکی رہیں۔
پڑوسی نے دو دفعہ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کو مدعو کرنے سے اس لئے گریز کیا ــــ کہ اُس کے گھر میں صرف ایک ہی آدمی کے کھانے کا انتظام تھا، لیکن جب اُس نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اصرار دیکھا اور تیسری دفعہ گھر جاکر کچھ اور سامان کرلیا تو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دعوت کی۔
اپنے مخلصوں کے ساتھ ایسی بے تکلفی جائز ہوتی ہے، کیسے سچے لوگ تھے وہ اور کس قدر سادہ اور ستھری معاشرت تھی ان کی، نہ چھوٹوں میں تکلف اور نہ بڑوں میں جھوٹی خاکساری
لوگ عورت کو پیر کی جوتی سمجھتے ہیں، جب چاہا اُتار پھینکا، جب چاہا بدل لیا، بیوی سے بات بات پر بدگمان ہو گئے، بات بات پر طلاق دیدی کہ پیر کی جوتی کی قیمت ہی کیا ــــ؟ لیکن رسولِ پاک صلی اللہ تعالیٰ وسلم نے تبلایا ہے عورت کی عزّت وہی ہے جو مرد کی عزّت ہے۔
اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبوب بیوی اور بڑی دانشور رفیقۂ حیات تھیں، منافقین نے ان کے خلاف نہایت خوفناک سازش کی۔ ایک بے بنیاد الزام کو اُچھالنا شروع کردیا۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنی عزت کا بھی خیال تھا اور یارِ غار صدیق اکبرؓ کی آبرو کا بھی اس لئے اِس غلط پروپیگنڈہ سے آپ بہت رنجیدہ ہوئے ایک طرف باعصمت بیوی پر آپ کو بھروسہ تھا، دوسری طرف منافقین کا اٹھایا ہوا طوفان تھا، بات صرف اتنی تھی کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ ایک سفر میں قافلہ سے بچھڑ گئی تھیں اور اگلی منزل پر ایک صحابی کے ساتھ پہونچی تھیں، دشمنوں نے اس بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ اور کئی مہینہ تک افواہیں پھیلاتے رہے، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اِس صدمہ سے بیمار پڑ گئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت مغموم رہنے لگے بالآخر خدا کی وحی نے سازش کا پردہ چاک کیا ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی پاکدامنی پر خود خدا نے شہادت دی۔

دوسرا کوئی ہوتا تو ایسے زوردار پروپیگنڈے سے ڈر کر بیوی کے ساتھ بہت کچھ کر گزرتا، بدسلوکی سے پیش آتا، طلاق دیدیتا، لیکن رسولِ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جیسے اچھے شوہر۔ معاملہ کی تحقیق کرتے رہے، محض دشمنوں کے الزام پر بیوی کو مجرم قرار نہیں دیا، دِل میں ایک وفادار بیوی کی جو عزت تھی اُس میں فرق نہ آنے دیا تاکہ دنیا سمجھ لے کہ عورت کا ناموس بھی مرد کے ناموس کی طرح قابل احترام ہے، وہ پیر کی جوتی کی طرح حقیر نہیں ہے اور نہ ہی پیدائشی گنہگار ہے۔

رسولِ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بیوی کے ساتھ ہی بیوی کے رشتہ داروں کو بھی عزت اور محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اُم المومنین حضرتِ خدیجۃ الکبریٰ رضؓ کی وفات کے بعد اُن کی سہیلیوں کو ہدیئے بھیجتے تھے۔

حضرتِ ہالہ، حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی بہن تھیں، ایک روز سالی اپنے بہنوئی حضرت محمد صلی اللہ علیہ سے ملنے آئیں، دروازہ پر اجازت طلب کی، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اُن کی آواز سُنکر چونک پڑے، ارشاد فرمایا ——— "یہ تو ہالہ کی آواز ہے" اُن کی آواز ام المومنین حضرت خدیجہ کی آواز سے ملتی جلتی تھی۔

لوگ سمجھتے ہیں۔ عورت کو اِس قدر دَبا کر رکھنا کہ وہ دم نہ مار سکے، مرد کا بڑا کمال ہے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ——— عورت پر اتنا جبر دَورِ جہالت کی یادگار تو ہو سکتی ہے مگر اسلام اسے تعریف کی بات نہیں سمجھتا۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بیویوں میں حضرتِ سَودہ رضی اللہ عنہا بڑی ظریف اور خوش طبع تھیں، ایک روز اُنھوں نے کہا۔

"حضور! میں رات کو آپ کے ساتھ نماز میں شریک تھی، آپ نے اس نماز میں رکوع کو اتنا لمبا کیا کہ مجھے رکوع میں جھکے جھکے اپنی نکسیر پھوٹنے کا شُبہ ہو گیا اور میں دیر تک ناک پکڑے رہی۔" آپ بیوی کے اِس لطیف مذاق پر ہنس پڑے۔

دنیا سمجھتی تھی کہ عورت اِنسان کو خدا کی یاد سے غافل کر دیتی ہے، اس غلط خیال نے مذہبی حلقوں میں عورت کو ہوّا بنا دیا تھا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک نے ہمیں بتایا کہ عورت کے بارے میں یہ خیال بالکل غلط ہے۔

اُم المومنین حضرتِ عائشہ صدیقہ رضؓ فرماتی ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

ہمارے ساتھ ہنستے بولتے ہوتے اور اذان کی آواز آجاتی تو آپ ہمیں چھوڑ کر اِس طرح اُٹھ کھڑے ہوتے جیسے ہمارے اور آپ کے درمیان کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔"

پیار و محبت کا اتنا پُر کیف ماحول بھی آپ کو خدا کی طرف سے ذرّہ برابر غافل نہ کر سکتا تھا، اذان کی آواز پر آپؐ اس طرح کھڑے ہو جاتے تھے جیسے آپ اس پکار کے منتظر ہی تھے۔

پُرانی دنیا نے عورت کے ساتھ جو زیادتی کی اُسے آپؐ نے دیکھا، اس کے مقابلہ میں یورپ کی جدید تہذیب نے عورت کو مذہب و اخلاق کی ہر بندش سے آزاد کر دیا نتیجہ یہ ہُوا کہ یورپ کی عورت کلبوں میں ننگی ناچ رہی ہے، مرد کو جوتی کی نوک پر مار رہی ہے اور مرد "زن مرید" ہو کر رہ گیا ہے۔

رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرتِ اقدس نے دنیا کو بتایا۔ کہ عورت کو اتنا آزاد کرنا بھی عورت کی بے عزّتی کرنا ہے، کیونکہ جب عورت ایک کی ہو کر رہنے سے انکار کر دے گی تو اپنا اعتماد کھو دے گی اور اس کے ناموس کا جوہر کوڑے کرکٹ سے زیادہ بے وقعت ہو جائے گا۔ اور دو ٹکے میں بکتی پھرے گی۔

حضرت عائشہ رضؓ سے حضورؐ کو اس قدر محبت تھی مگر اس کے باوجود جب کبھی آپ انہیں کوئی غیر مناسب بات دیکھتے تھے تو انھیں سختی کے ساتھ تنبیہہ فرما دیتے تھے۔

ایک دفعہ اُمّ المومنین حضرتِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے

اپنی سوکن اُم المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں مذاق کے طور پر کوئی نامناسب جملہ کہہ دیا۔ خود فرماتی ہیں — میرے مُنھ سے وہ جملہ سن کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک دم بگڑ گئے، یا تو آپ محبت سے التفات فرما رہے تھے یا آپ کا چہرہ فوراً غصّہ سے سرخ ہوگیا اور ارشاد فرمایا۔
"عائشہ تم نے وہ بات کہی ہے کہ اگر اس کو سمندر کے پانی میں ڈالدیا جائے تو سمندر کا پانی بھی کڑوا ہو جائے"

غزوہ تبوک کے بعد کا قصّہ ہے، لشکر اسلام جب اِس غزوہ سے کامیاب ہو کر واپس لوٹا تو اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ نے تمام مسلمانوں اور خاص کر اپنے شوہر کی سلامتی کے ساتھ واپسی کی خوشی میں گھر کو سجایا اور اُسی کے ساتھ — دروازہ پر ایک تصویر والا پردہ لٹکا دیا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب دروازہ پر قدم رکھا تو آپ کا چہرہ غصّہ سے سرخ ہوگیا، مزاج پہچاننے والی بیوی نے شوہر کے چہرہ پر نظر ڈالی اور عرض کیا۔ "حضور۔ قصور معاف ہو۔ کیا خطا ہوئی۔ ارشاد ہوا — عائشہ خدا نے ہمیں دولت اِس لئے نہیں دی کہ ہم اُسے اینٹوں اور پتھروں کی آرائش پر خرچ کریں۔

یہاں حال یہ ہے کہ باتوں ہی — باتوں میں ساس، نندوں کی غیبت ہوتی ہے، لوگوں کی برائی بھلائی ہوتی ہے اور شوہر میں ہمّت نہیں ہوتی کہ گناہ کی بات پر بیوی کو ٹوک دے لیکن رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کسی حال میں کسی نامناسب بات کو برداشت نہیں کرتے تھے اور غلط بات پر فوراً ہی بیویوں کو تنبیہ فرمادیتے تھے۔

انسان اپنے معاملات میں دوسرے سے مشورہ لینے کو اپنی خودداری کے خلاف سمجھتا ہے اور پھر بیوی سے مشورہ ـــــ؟ جو ویسے بھی لوگوں کے نزدیک گھر کی ماما سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس لحاظ سے بھی عورت کی عزت بڑھائی اور "خدا کے رسول" ہو کر بھی اپنی بیویوں سے مشورہ لینے کی سنّت قائم فرمائی۔

صُلح حدیبیہ کے موقع پر صحابہ کرام رضؓ کا دِل بہت ٹوٹ گیا تھا، معاہدہ کی بعض شرطیں ان کی نظر میں کمزور تھیں، چنانچہ معاہدہ کے بعد جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قربانی کے اونٹ ذبح کرنے کا حکم دیا تو ہمیشہ حُکم ماننے والے صحابہ رضؓ کی ہمّتیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صحابۂ کرام رضؓ کی اِس پژمردگی کو دیکھ کر بہت پریشان ہوئے جو صحابہ رضؓ نبی کے ایک اشارے پر جان لڑا دیتے تھے ان پر آج اس قدر جمود اور سستی طاری تھی واقعی یہ بات پریشانی کی تھی۔ اِس موقعہ پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مشہور دانشور بیوی ام المومنین حضرتِ اُمِّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں، آپ حضرتِ اُمِّ سلمہ کے خیمہ میں آئے اور صحابۂ کرام کی حالت بتا کر اُن سے دریافت فرمایا ـــ اب کیا کیا جائے ـــ؟

اُمِّ سلمہ رضؓ نے عرض کیا۔ حضور آپ اِس قدر پریشان نہ ہوں، آپ ایسا کریں کہ صحابہ رضؓ کے سامنے اپنا اونٹ ذبح کریں اور احرام اُتارنے کے لئے اپنا سر منڈوا دیں پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے ـــ؟ حضور صلی اللہ تعالیٰ نے اپنی بیوی کے مشورہ پر عمل کیا اور قربانی کا اونٹ سب صحابہ رضؓ کے سامنے لا کر ذبح کر دیا،

اور احرام کھولدیا ــــ بس کیا تھا۔ صحابۂ کرام رضؓ حضور کے عمل کو دیکھ کر دوڑ پڑے، نبیؐ کے نقشِ قدم پر جان دینے والے اونٹ ذبح کرنے اور سر منڈوانے کے لئے ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے۔

اُم المومنین حضرتِ اُمِّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مشورہ انسانی نفسیات کے عین مطابق تھا، کیونکہ اِنسان پر لفظوں کی جاذبیت کے مقابلہ میں عمل کے جادو کا بہت جلد اثر پڑتا ہے۔

دُنیا یہ سمجھتی ہے کہ عورت بچے پیدا کرنے کی صرف ایک جاندار مشین ہے اور شہوت رانی کا ایک ذریعہ ہے لیکن رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بتایا کہ عورت کی اِس سے زیادہ کوئی تحقیر اور بے عزتی نہیں ہے کہ اُسے محض حیوانی خواہش پورا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا جائے، عورت تو دراصل زندگی کی اہم ذمہ داریوں میں مرد کی رفیق ہے اور بہت سے اخلاقی اور مذہبی فرائض میں مرد کی مددگار ہے، زن و شوئی کا خاص تعلق ان فرائض کی ادائیگی کا وسیلہ ہے مقصود نہیں ــــ یہی وہ عظیم فرق ہے جو انسانوں اور حیوانوں کے جنسی تعلق کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے، اور رسولِ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے اُسوۂ حسنہ سے اِس فرق کو واضح کردیا ہے۔

غور کیجئے ــــ! ۲۵ سال کی عمر تک کا زمانہ جوانی کی رنگین اُمنگوں اور حسین ولولوں کا نہایت پُرکیف زمانہ ہوتا ہے، یہ سارا زمانہ رسولِ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بغیر بیوی کے مجرد رہ کر گزارتے ہیں اور ایسی پاک بازی کے ساتھ گزارتے ہیں کہ آپ کے کیرکٹر پر کسی کو اُنگلی اٹھانے کا موقعہ نہیں، یہی نہیں بلکہ

ایسی پاکبازی جس پر ساری قوم فخر کرتی ہے، جس دور میں قوم کی طرف سے آپ کی شدید مخالفت کی جاتی ہے اس دور میں بد سے بدتر دشمن کو بھی رسولِ اکرم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اخلاق پر طعن کرنے کی جرأت نہیں ہوتی، دشمن اگر چال چلن پر ذرا سا بھی داغ پالیتے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے شخصی وقار کو گرانے کے لئے میل کا بیل بنانے سے بھی گریز نہ کرتے لیکن جہاں ایک نوجوان کی جوانی چاند، سورج سے زیادہ نورانی پھولوں کی طرح پاکیزہ اور معطر اور فرشتوں کے لئے قابل رشک ہو وہاں دشمن کہے تو کیا کہے؟ ابوجہل اور ابولہب نے سب کچھ کہا مگر اُن میں سے کوئی یہ نہ کہہ سکا کہ اس شخص میں فلاں اخلاقی کمزوری ہے، یہ آج کس منھ سے نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے، یہ بات نہ کوئی کہہ سکا اور نہ کہہ سکتا تھا۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اپنی ہی پچھلی زندگی کو دلیل بنا کر پیش کیا اور ارشاد فرمایا۔ سورۂ یونس کی یہ آیت ملاحظہ ہو۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ط

میں رہ چکا ہوں تم میں ایک مدت تک اس سے پہلے۔ تم جانتے نہیں؟

یہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف سے قریش کو زبردست چیلنج تھا مگر کس میں ہمت تھی کہ قبول کرتا اور آپ کی اخلاقی زندگی پر کہیں انگلی رکھتا۔

۲۵ سال اس پاک بازی کے ساتھ (عرب جیسے گندے ماحول میں) گزارنے کے بعد عرب کی معزز خاتون، اُمّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عقد فرمایا۔ جو عرب کی دوشیزہ

نہیں بلکہ چالیس سال بیوہ تھیں، پھر ایک دفعہ کی بیوہ نہیں، وہ بیوہ جس کی زندگی پر دو دفعہ بیوگی کے چرکے لگ چکے تھے، مگر کی اس بیوہ سے شادی کرنے کے بعد اس ہاشمی نوجوان نے عمر کے ۲۸ سال (زندگی کے بہترین سال) اسی بیوہ کے ساتھ گزارے، بدمزگی اور ناگواری کے ساتھ نہیں بلکہ پورے سکون اور شریفانہ سلوک کے ساتھ اور ایسی محبت کے ساتھ کہ شوہر چالیس چالیس دن پہاڑوں میں اور غاروں میں بیٹھ کر خدا کی عبادت کرتے تھے اور بیوی (جذباتی اعتبار سے) اس بے کیف زندگی پر خفا نہ ہوتی تھیں، شکایت نہ کرتی تھیں بلکہ اس کام میں اپنے خاوند کی پوری مدد کرتی تھیں تاکہ وہ پوری دلجمعی کے ساتھ خدا کی عبادت کرتے رہیں، رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی کے یہ ۲۸ سال نبوت کی سچائی کی مستقل دلیل اور مستقل معجزہ ہیں:

آپ نے اس دور میں ثابت کر دیا کہ اگر رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خواہش نفس کے بندے ہوتے، اگر رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بیویوں کے معاملہ میں محض ایک "دنیا دار" ہوتے تو عمر سے اتری ہوئی ایک بیوہ عورت کو جوانی کی عمر میں پسند نہ کرتے اور اگر کسی دباؤ یا لالچ کے تحت کر لیا تھا تو ایک دو سال نہیں پورے ۲۸ سال اس دلجمعی اور محبت کے ساتھ نہ گزارتے، بہر حال جب ۲۸ سال آپ نے ام المومنین حضرتِ خدیجہؓ کے ساتھ گزار دیئے اور آپ کی عمر شریف ۵۳ برس کی ہوئی تو آپ کی رفیقۂ حیات کا انتقال ہو گیا۔

اُم المومنین حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم

نے اپنے رفیق خاص حضرتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی حضرت عائشہ رضؓ سے عقد فرمایا اور اس کے بعد ۳ھ ہجری سے ۷ھ تک ۴ سال میں عرب کے مختلف خاندانوں کی آٹھ معزز بیوہ عورتوں کو اپنے عقد میں قبول فرمایا۔ لیکن کیا ۵۳ برس کی عمر میں رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بیویوں کی اِس کثرت پر کسی طرح کا الزام دیا جا سکتا ہے ــــ؟ ایک دفعہ پھر غور کیجیے ــــ! عمر ڈھل چکی ہے، قوتیٰ میں طبعی طور پر انحطاط اور اضمحلال ہو رہا ہے، زندگی بڑی بڑی اجتماعی، سیاسی اور انفرادی ذمہ داریوں کے بوجھ کو اُٹھائے ہوئے ہے، دشمنوں کے پے در پے حملوں کی روک تھام کے لئے مسلسل غزوات برپا ہو رہے ہیں جن کی قیادت ایک جرنیل کی حیثیت سے رسولِ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بنفس نفیس خود فرما رہے ہیں، زندگی امیرانہ نہیں غریبانہ اور نہایت غریبانہ گزر رہی ہے، گھر میں تو فاقے ہوتے ہیں مگر یہاں میدانِ جنگ میں پیٹ پر پتھر باندھنے کی نوبت آرہی ہے، نفس کشی کا یہ حال ہے کہ کئی کئی دن پیہم روزے رکھے جاتے ہیں اور راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر خدا کی عبادت کی جاتی ہے، اتنی جفاکشی کے ساتھ کہ کھڑے کھڑے پیر سُوجھ جاتے ہیں، ایسی مصروف، مشغول، عیش و آرام سے محروم جوانی طبعی جذبات سے دور انقلابی ہنگاموں میں گھری ہوئی زندگی کے متعلق کیا ہوس رانی کا شبہ بھی ہو سکتا ہے ــــ؟ معاذ اللہ ــــ! کیا یہ وہم بھی ہو سکتا ہے کہ ایسی عظیم شخصیت کا مقصدِ حیات محض خواہش نفس کی تسکین تھی۔ توبہ ــــ توبہ۔ جوانی کی جس منزل میں اِس قسم کے شبہات کی طبعاً گنجائش ہوتی ہے جب وہ منزل پاکبازی میں گزر گئی

جس کی مثال رسولوں کے سوا کہیں نہیں ملتی، تو عمر کے اس حصہ میں گوناگوں۔ ذمہ داریوں کے اس دور میں کسی قسم کا شبہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔

اب آپ یہ سوال کریں گے کہ اگر بات یہ ہے تو پھر رسولِ پاک صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اس قدر شادیاں کیوں کیں ــــ؟ اس سے آپ کا مقصد کیا تھا۔

اس کا جواب یہ ہے :- کہ شادیوں کے عام مفہوم اور عام قانون سے بالاتر اور مستثنیٰ کر کے خدا تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی شادیاں کرنے کی اجازت اس لئے دی تھی ــــ اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس لئے اس پر عمل کیا تھا کہ ان پاک بیویوں کے ذریعہ عورتوں کے مسائل کی اشاعت کا مستقل انتظام ہو جائے۔

غرضیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بیوی جس قدر سمجھدار تھیں انھوں نے اپنی اہلیت کے مطابق حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اتنا ہی علم حاصل کیا اور ان سے اُمت کو اسی قدر فیض پہونچا اور اس لحاظ سے تاریخ میں ام المومنین حضرتِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مقام بلند نظر آتا ہے۔

تاریخ میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنی بیویوں میں حضرت عائشہ صدیقہ رضہ کے ساتھ زیادہ محبت تھی لیکن کیا وہ محبت شکل و صورت کی وجہ سے تھی ــــ؟ نہیں، یہ بات نہیں تھی، شکل و صورت میں ام المومنین حضرت صفیہ رضہ اور دوسری بیویاں بہت بڑھ چڑھ کر تھیں۔

ام المومنین حضرتِ عائشہ صدیقہ سے زیادہ محبت کرنے وجہ ان کی لیاقت اور اہلیت تھی، ان کا تقویٰ تھا۔ چنانچہ تاریخ آپ کے سامنے ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ نے علم و فضل کے میدان میں جو بلند درجہ حاصل کیا وہ کسی دوسری بیوی کو حاصل نہ ہو سکا، حالانکہ رسول پاک صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت کرنے اور آپ سے علم حاصل کرنے کا موقعہ تمام ازواج مطہرات کو یکساں ملا۔

اوپر یہ بات بالکل صاف ہوگئی کہ رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اتنی شادیاں محض خواہش نفس کے تحت نہیں کی تھیں بلکہ آپ کا مقصد دین پھیلانے کے لئے ذہین، تجربہ کار اور عرب کے بڑے بڑے خاندانوں پر اثر رکھنے والی عورتوں کی ایک جماعت تیار کرنا تھا۔

اب آپ اِس جگہ سوال کر سکتے ہیں کہ جو پاک بیویاں آپ کے حرم میں داخل ہوئیں۔ کیا اُن کا مقصد بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دامنِ تربیت میں فیض حاصل کرنا تھا۔ یا اُن کا مقصد کوئی دوسرا تھا۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی پاک بیویاں بھی سمجھ بوجھ کر حرم میں داخل ہوئیں تھیں اور اُن سب کا مقصد دنیا نہیں بلکہ دین تھا، اگر اِن اُمہات المومنین کا مقصد دولت و لذت حاصل کرنا ہوتا تو عرب کے نوجوان امیروں اور دوسرے دنیا دار سرداروں کو تلاش کرتیں اور پیغمبر کے غریب گھر میں اتنی قناعت اور خدمت کے ساتھ اپنی زندگیاں نہ گزارتیں

قرآنِ کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امہاتُ المومنین نے زندگی میں صرف ایک دفعہ نان نفقہ اور گزر گزران میں سہولت و آسائش کے بارے میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے مطالبہ رکھا۔ اور دوسروں کو آسودہ حال دیکھ کر آسودہ زندگی بسر کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

یہ بات عورت کی فطرت کے مطابق تھی اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی عورت کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتے تھے مگر اس موقعہ پر عورتوں کا وہ مطالبہ آپ کو بُرا معلوم ہوا اور آپ نے اُمّہات المومنین سے الگ رہنے کی قسم کھائی ایک مہینہ گزر گیا۔ آپ نے اُن سے بات نہ کی اُس کے بعد وحی آئی۔

قُلْ لِاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ	اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم چاہتی ہو دنیا کی زندگانی اور یہاں کی رونق تو آؤ میں تمھیں کچھ فائدہ پہنچا دوں

سَرَاحًا جَمِيْلًا وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ؕ
(سورہ احزاب)

اور تمھیں بھلی طرح سے رخصت کردوں اور اگر تم چاہتی ہو اللہ کو اور اس کے رسول کو اور پچھلے گھر کو تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جو تم میں نیکی پر ہیں بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے۔

رسولِ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق اپنی تمام بیویوں سے ارشاد فرمایا۔ اگر تم دنیا چاہتی ہو تو میرے پاس دُنیا نہیں ہے آؤ میں تمھیں رخصت کردوں اور جہاں تمھیں دنیا ملے تم وہاں چلی جاؤ، البتہ اگر تم اپنی آخرت کی زندگی بلند کرنا چاہتی ہو تو ضرور میرے ساتھ رہو۔

تاریخ سے پوچھو۔ وہ بتاتی ہے کہ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے لیکر حضرت صفیہ رضؓ تک تمام بیویوں نے ایک ہی جواب دیا اور یہی کہا۔

"حضور! ہم نے دنیا کے مقابلہ میں خدا اور اس کے رسول کو پسند کیا"

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پاک بیویوں میں سے ایک بیوی بھی اگر دنیا کی طالب ہوتی اور حرم رسول میں رہنے سے اُس کا مقصد دنیا کا عیش ہوتا تو وہ اس موقعہ پر کبھی نہ چوکتی اور رسولِ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے طلاق حاصل کرلیتی۔ مگر یہاں معاملہ کی نوعیت یہ ہے ؎

تری خوشی سے جو حاصل ہمیں خوشی نہ ہوئی
یہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی

حضورؐ جفاکش ساتھی کی حیثیت سے

مدنی آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم شروع ہی سے محنت اور جفاکشی کے عادی تھے، جوانی میں بکریاں چرائیں، تجارت کی، تجارت میں سفر کی تکلیفیں جھیلیں بچپن تھا کہ کعبہ کی تعمیر ہوئی اور اپنے بزرگوں اور ساتھیوں کے ساتھ سر پر پتھر اُٹھا اُٹھا کر لائے بھتیجے کی جفاکشی دیکھ کر چچا کو ترس آگیا۔ اور بھتیجے کے سر پر کپڑا رکھ دیا۔

ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے تو سب سے پہلے قبا کی بستی میں قیام فرمایا، اِس بستی کو مہاجرین کی پہلی منزل بننے کا شرف حاصل ہوا، اِس بستی میں رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چودہ دن مقیم رہے، قیام کے زمانے میں محبوب خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے مبارک ہاتھوں سے مسجد کی بُنیاد رکھی۔

مسجد قبا کی تعمیر

خدا کی زمین پر خدا کا پہلا گھر بنایا جا رہا ہے، خدا کے بندوں میں بڑا جوش و خروش ہے ایک ایک مسلمان مسجد کی تعمیر میں شریک ہے، مدنی آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آقا اور سردار ہو کر بھی آقاؤں کی طرح محض حکم ہی نہیں دے رہے ہیں بلکہ ایک معمولی مزدور کی طرح خود بھی بھاری پتھر اُٹھا کر لا رہے ہیں۔ بھاری پتھر اُٹھا کر لانے سے جب سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نازک جسم خم ہو جاتا ہے تو

جاں نثار ساتھیوں سے رہا نہیں جاتا - دوڑ کر آتے ہیں، عرض کرتے ہیں —
"ہمارے ماں باپ حضور پر قربان" آپ تکلیف نہ فرمائیں۔ خدام کافی
ہیں، " لیکن حضور اُن کی درخواست قبول نہیں فرماتے اور دوسرا پتھر
اُٹھانے چلے جاتے ہیں۔

یہ خدا کا پہلا عبادت گھر بنایا جا رہا ہے، خدا کے بندے آقا اور غلام
خوشی سے پھولے نہیں سماتے -- یہ راج بھی ہیں - مزدور بھی ہیں۔ مِل جُل کر
شانہ سے شانہ ملا کر کام کرتے جاتے ہیں اور بڑے جادو بھرے ترنم میں
بندگی کا یہ ترانہ گاتے جاتے ہیں۔

افلح من یعالج المساجدا ویقرءُ القراٰن قائماً وقاعدا
ولا یبیتُ اللیل عند راقدا

آقا صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر ہر قافیہ کے ساتھ آواز ملاتے جا رہے ہیں
کیا عجب سماں ہوگا، آسمان رحمت کے پھول برسا رہا ہوگا، کامیابی انسانی
زندگی کے معماروں کی بلائیں لے رہی ہوگی۔

اِن اشعار کا مطلب یہ ہے — کہ کامیابی اُس شخص کے لئے ہے جو
مسجدیں بنائے، خدا کے گھروں کی تعمیر کرے، اُٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھے اور
راتوں کو عبادت کے لئے جاگے۔

اب یہ مسجد پتھروں اور گارے کی معمولی عمارت نہ تھی بلکہ خدا کا وہ پاک
گھر تھا جس کی تعریف میں خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لمسجد اسس علی التقویٰ   یہ مسجد پرہیزگاری کی بنیاد پر کھڑی کی گئی ہے

مسجدِ نبوی کی تعمیر

اب مسجد نبوی کی تعمیر کا منظر ملاحظہ ہو اس کی تعمیر میں بھی سرکار صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ساتھ شریک ہیں، گارا بھی اُٹھا کر لارہے ہیں اور پتھر بھی، ساتھی محبوب آقا کو ایک مزدور کی طرح کام کرتے دیکھ کر چلا اُٹھتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

لئن قعدنا والنبیؐ یعمل　　لذاک منّا العمل المضلل

یعنی۔ اگر خدا کے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مزدوروں کی طرح کام کرتے رہے اور ہم بیٹھے دیکھتے رہے تو ہمارا سارا کیا کرایا غارت ہوا۔

پھر ایک عجیب بات یہ بھی دیکھی کہ غلاموں کو شرم آرہی ہے کہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم محنت کا کام کررہے ہیں اور آقا کو ترس آرہا ہے غلام بڑی مشقت اُٹھا رہے ہیں۔ کیا محبت ہے غلاموں کے دل میں آقا کی اور کیا شفقت ہے آقا کی غلاموں پر۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔ کہ ہم لوگ ایک ایک پتھر لارہے تھے اور حضرتِ عمّار بن یاسر دو دو پتھر لارہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر جو حضرت عمار پر پڑی تو آپ کو حضرت عمار کی محنت پر پیار آگیا، آپ حضرت عمارؓ کے قریب پہنچے، اپنے مبارک ہاتھوں سے حضرت عمارؓ کی کمر سے مٹی جھاڑی اور اُن کی حق پرستی کی گواہی دیتے ہوئے اُن کے انجام کے بارے میں فرمایا۔ عمّار۔ تمھیں خدا تعالیٰ دینِ حق پر استقامت عطا فرمائے۔ تمھیں ایک نافرمان گروہ قتل کرے گا۔

اس موقعہ پر بھی محنت کی گرما گرمی دل بہلانے کے لئے بیہودہ گوئی کا مظاہرہ

نہیں ہے، گھٹیا قسم کا مذاق نہیں بلکہ آخرت کی یاد ہے اور خداوند قدوس سے دُعا مانگی جارہی ہے اور فرمارہے ہیں۔

لا عیش الا عیش الاخرہ اللّٰھم ارحم الانصار والمھاجرہ

آخرۃ کی ابدی زندگی ہی درحقیقت حقیقی زندگی ہے۔ اے اللہ! تو انصار اور مہاجرین پر رحم فرما۔

اب جفاکش آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو میدانِ جنگ میں دیکھئے۔ عرب کے تمام قبیلوں نے اپنی متحدہ طاقت سے مدینہ کی پُرامن بستی پر دھاوا بول دیا ہے — — سرورِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہیں مدینہ پاک سے باہر خندق کھودنے کے انتظامات ہو رہے ہیں، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود ہی خندق کی حدیں قائم کی ہیں۔ دس دس آدمیوں پر دس دس گز زمین تقسیم کردی گئی، پانچ گز گہری خندق کھودنی ہے، تین ہزار مجاہدین مزدور بنے ہوئے ہیں، کھدائی کا کام کر رہے ہیں، سرکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی اُن کے ساتھ ایک مزدور کی طرح کھدائی کے کام میں لگے ہوئے ہیں، سردی کی راتیں ہیں، نہ کھانے کا ہوش ہے نہ پینے کا، اگر جان نثار ساتھی فاقہ کے مارے پیٹ پر پتھر باندھے اپنے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھوک کی شکایت کرتے ہیں تو سرکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی اپنا پیٹ کھول کر دکھا دیتے ہیں جس پر تین پتھر بندھے ہوئے نظر آتے ہیں، محبوب خدا جب مٹی کی ٹوکری سر پر رکھتے ہیں تو اس میں سے مٹی چھن چھن کر آپ کے اوپر گرتی ہے اور اس سے آپ کے سینۂ اقدس پر مقدس بالوں کی جو دھاری ہے وہ مٹی میں اَٹ جاتی ہے۔ خندق کھودتے کھودتے

اتفاق سے پتھر کی ایک چٹان آجاتی ہے، صحابۂ کرام زور آزمائی کرتے ہیں مگر کسی صحابی سے وہ چٹان نہیں ٹوٹتی، سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں اور کدال ہاتھ میں لے کر اس چٹان پر مارتے ہیں اور آپؐ کی ایک ہی چوٹ سے چٹان کے ٹکڑے اڑ جاتے ہیں اور یہ اُس وقت کی بات ہے جب رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تین وقت کی بھوک سے نڈھال نظر آتے تھے، یہ تو قومی اور اجتماعی کاموں میں رحمتِ عالم سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جفاکشی اور محنت پسندی کا نظارہ تھا۔ اب گھریلو زندگی میں آپ کی محنت اور جفاکشی کا حال سنیئے۔

زندگی کی پیاری رفیقۂ حیات اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حضرت اسود بن زید نے پوچھا — اُمّ المومنین۔! ہمارے آقا اپنے گھر میں کیا کیا کام کیا کرتے تھے۔؟

حضرتِ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ارشاد فرمایا۔

کان فی محنۃ اھلہ فاذا سمع الاذان خرج

۔ سرکار اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے گھر والوں کے ساتھ کام کاج میں شریک رہتے جب اذان کی آواز سنتے تھے تو فوراً چلے جاتے تھے

اللہ تعالیٰ نے محنت پسند رسولؐ کی امت کو بھی جد وجہد کا حکم دیتے ہوئے فرمایا

وَجاھدوا فی اللہ حق جھادہ ھو اجتبٰکم (حج)

اور محنت کرو اللہ کے واسطے جیسی کہ چاہیے اس کے واسطے محنت اس نے تم کو پسند کیا (ترجمہ شاہ عبد القادرؒ)

اللہ کے واسطے محنت صرف نماز، روزہ ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ حلال روزی کمانے اور بال بچوں کی پرورش و تربیت کے لئے انسان جو کوشش کرتا ہے وہ بھی "اللہ کے واسطے" کہلاتی ہے، ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے

فاتقوا اللہ واجملوا فی الطلب (عن ابن مسعودؓ) خدا سے ڈرو اور روزی کی تلاش کرنے میں خوب کوشش و محنت کرو۔

ایک سفر میں صحابہ کرامؓ نے بکری ذبح کی، اس کے پکانے کے لئے آپس میں کام بانٹ لئے آپ نے فرمایا۔ "میں جنگل سے لکڑیاں لاؤں گا۔" صحابہؓ کو اس میں تامل ہوا تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں امتیاز پسند نہیں کرتا۔

حضورؐ مساوات پسند رہنما کی حیثیت سے

یوں تو تہذیب کے اس دور میں ہر در و دیوار سے یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ تمام انسان بھائی بھائی ہیں، رنگ و نسل کا امتیاز ختم کرو۔ کالے گورے کا فرق مٹاؤ۔ مگر یقین جانئے یہ نعرہ کھوکھلا نعرہ ہے رنگ و نسل کا امتیاز باقی ہے، ایشیا میں باقی ہے، یورپ میں باقی ہے، آپ پوچھیں گے کہ آج دنیا مساوات و برابری قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہے، مگر پھر بھی ناکام ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے ——؟

اس کا جواب یہ ہے کہ انسانی بھائی چارہ اور برابری کا تصور بغیر

عقیدۂ توحید کے پیدا نہیں ہو سکتا، مشرک ذہن تنگ ہوتا ہے جو انسانی برادری کے وسیع رشتہ کو قبول نہیں کرتا۔

اسلام انسانی برادری میں برابری پھیلانے میں اس لئے کامیاب ہوا کہ اس نے سب سے پہلے کہا۔ لوگو! مالک و آقا، معبود اور حاکم صرف ایک ہے، باقی سب اُس کے بندے ہیں۔ بندے، بندے میں کیا فرق۔؟ محکوم میں چھوٹے بڑے کا کیا امتیاز ہے؟

پھر قرآن نے اعلان کیا۔ لوگو۔! تمھارے رب نے تم سب کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا، پھر تمھیں مختلف خاندانوں اور ذاتوں (قبیلوں) میں بانٹ دیا اور اپنے پروردگار کی نگاہ میں قابل عزت وہی ہے جو اس سے ڈرتا ہے۔ (سورۂ حجرات)

یہ اعلان خدا کا تھا۔ اُس قوم میں جو نسل پرستی کے نشے میں چور تھی اس لئے اِس قوم کے غرور کو پاش پاش کرنے کے لئے... صرف یہ اعلان کافی نہ ہو سکا تھا۔ اِس اعلان کے ساتھ ضرورت تھی ایک زندہ نمونے کی، انقلاب انگیز عمل کی، جو دلوں کی دُنیا کو بدل دے، چنانچہ وہ پاک عمل اور پاکیزہ سیرت بھی انسانی.... نگاہوں کے سامنے آگئی۔ اور اس طاقت اور اس زور کے ساتھ کہ نسلی غرور کا بت پاش پاش ہو گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نسلی غرور کو ختم کرنے کے لئے سب سے اہم قدم تو یہ اٹھایا کہ اپنی پھوپی زاد بہن حضرت زینب کا حضرت زید سے نکاح کر دیا۔ یہ زید آزاد کردہ غلام ہیں اور حضرت زینب قریش کی صاحب عزت خاتون

اس لیئے ایک قریشی خاتون اور ایک غلام کے رشتہ نکاح نے تمام قریش میں ہل چل مچادی اور لوگوں نے یقین کرلیا کہ خدا کا یہ آخری رسول اونچ نیچ اور رذیل و شریف کی مصنوعی دیواروں کو توڑ کر رہے گا۔

دوسرا اہم واقعہ اِس سلسلے میں حضرت اُسامہ بن زید کی امارت (سرداری) کا ہے۔ ہُوا یہ کہ۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے کچھ دن قبل غزوۂ روم کے لیئے ایک لشکر تیار فرمایا۔ اور حضرت اُسامہ رض کو بلا کر فرمایا۔ "میں نے تمھیں اِس فوج کا سردار (امیر) مقرر کیا" پھر اپنے دستِ مبارک سے اُسامہ رض کو جھنڈا عطا فرمایا۔ اُس وقت حضرت اُسامہ رض کی عمر بیس سال کی تھی۔

اِس لشکر میں تمام بڑے بڑے انصار اور مہاجر صحابہ رض شریک ہیں اور اُسامہ رض سے زیادہ بزرگ بھی ہیں، اِن سے زیادہ میدانِ جنگ کے تجربہ کار بھی ہیں اِس لیئے بعض صحابہ رض کے منھ سے یہ نکل گیا کہ ایک کم عُمر لڑکے کو بڑے بڑے انصار و مہاجرین پر امیر مقرر کر دیا گیا ہے۔

حضرتِ عمر رض کو معلوم ہوا، آپ اُن لوگوں کے پاس پہنچے اور اُنھیں حضرتِ اُسامہ رض کی سرداری کے بارے میں مطمئن کرنے کی کوشش کی، معاملہ میدانِ جنگ کا تھا جہاں ایک سپاہی کی بد دلی بھی نقصان پہنچا دیتی ہے، اِس خیال سے حضرتِ عمر رض نے بعض لوگوں کی بے اطمینانی کا حضور سے ذکر کیا، حضور سرورِ عالم کو اِس خبر سے بہت رنج ہوا، آپ مرضِ وفات میں مبتلا تھے، سر میں درد تھا اِسی حال میں آپ نے ہمّت کی، سر سے پٹی باندھی اور بستر سے

اُٹھ کر مسجد میں تشریف لائے صحابہ کرام رضؓ حاضر تھے آپ نے ممبر پر بیٹھ کر فرمایا۔ لوگو۔! یہ میں کیا سن رہا ہوں کہ تم میں سے کچھ لوگ اُسامہ کی سرداری پر بے اطمینانی کا اظہار کر رہے ہیں اور یہ طعن کوئی پہلا طعن نہیں ہے، اس سے پہلے بھی تم لوگ اس کے باپ زید کی امارت پر اعتراض کر چکے ہو، حالانکہ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ زید بھی قیادت کا اہل تھا اور اس کا بیٹا اُسامہ رضؓ بھی اس کا اہل ہے وہ بھی رسول کا محبوب تھا اور اُسامہ رضؓ بھی محبوب ہے۔

اعتراض کرنے والوں نے گو بظاہر حضرت اُسامہ رضؓ کی کم سنی کو نشانہ بنایا لیکن لوگوں کے دلوں میں جو بات تھی خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بھانپ گئے تھے اور وہ بات تھی حسب و نسب کا تکبّر، چنانچہ آپ نے دلوں کے اس چور کو آشکار فرما دیا اور بعض لوگوں کی اس خواہش کو ٹھکرا کر یہ ثابت کر دیا کہ اسلام ہر کام میں اہلیت کا قائل ہے حسب و نسب کی بڑائی اور خاندانی شرافت اور رذالت اس کے نزدیک بے حقیقت بات ہے۔

سوسائٹی میں مساوات اور برابری کی روح پھونکنے کے لئے رسول پاک نے اپنے متبعین کو "صحابی" کہہ کر پکارا۔ صحابی کے معنی ساتھی اور رفیق کے ہیں۔ ایک موقعہ پر صحابہ کرام رضؓ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ تم میرے صحابہ (ساتھی یا دوست) ہو اور جو لوگ بغیر دیکھے مجھ پر ایمان لائیں گے وہ میرے بھائی ہوں گے[1]

ایک حبشی عورت حضور کی مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی اُس کا انتقال ہو گیا

---

[1] تفسیر عزیزی سورہ بقرہ رکوع اوّل

صحابۂ کرامؓ نے اس کی تجہیز و تکفین کر کے اُسے دفن کر دیا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن صحابۂ کرامؓ سے پوچھا وہ خادمہ کہاں ہے ۔۔۔؟ لوگوں نے کہا۔ حضور۔! اس کی وفات ہوگئی ہم دفن کر آئے، آقا بہت برہم ہوئے۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔ حضور! ہم نے خیال کیا کہ آپ کو کیا پریشان کریں۔ فرمایا۔ چلو۔! اُس نیک بندی کی قبر بتلاؤ۔ صحابۂ کرامؓ ساتھ گئے اور حضور نے اُس حبشی عورت کی قبر پر تشریف لے جا کر اُس کے لئے دُعائے مغفرت فرمائی ؏

آج حالت یہ ہے کہ بڑے آدمیوں کے جنازے میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور چھوٹے آدمیوں کے جنازے میں رشتہ داروں کے کندھے دُکھ جاتے ہیں، کندھا دینے والے نہیں ملتے۔ حضور نے ایک غریب عورت کے جنازے میں شریک نہ ہونے پر اظہارِ غم و افسوس فرمایا۔ صحابہؓ پر خفگی فرمائی اور قبرستان پہنچ کر اُس کے لئے دُعا کی تاکہ اُمّت سمجھ لے کہ چھوٹے آدمیوں کے لئے دُعا کرنا اور اُن کے جنازہ میں شریک ہونا رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ہے،

ایک مرتبہ عرب کے معزز سردار اپنے بھتیجے محمدؐ سے شکایت کرتے ہیں کہ محمدؐ۔! تم نے عرب کے ان رذیلوں کو سر چڑھا لیا ہے، ان کے ساتھ مل جل کر بیٹھتے ہو ۔۔۔ محمدؐ۔۔۔! اگر تم چاہتے ہو کہ ہم بھی تمہاری محفل میں شریک ہو کر تمہارا پیغام سنیں تو بلال، صہیب اور دوسرے غلاموں کو تاکید کر دو

؏ حدیث کے الفاظ یہ ہیں فَاَتیٰ قبرہٗ فصلّی علیہ

کہ وہ ہمارے اوقات میں نہ آیا کریں، ہم اُن کے ساتھ ایک محفل میں بیٹھ کر اپنی بے عزتی نہیں کرانا چاہتے۔

یہ وہ مغرور سردار ہیں جو رسول کی محفل میں آنا گوارا نہیں کرتے مگر وہ اِس شرط کے ساتھ آنے کا وعدہ کر رہے ہیں کہ غلاموں کو ہمارے اوقات میں آنے کی ممانعت کر دی جائے،

یہ شرط اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم منظور فرما لیتے تو ابوجہل، عتبہ جیسے روسائے قریش آپ کی مجلس وعظ میں آنے جانے لگتے اور ان ضدی سرداروں کی ضد ٹوٹ جاتی مگر وحیِ الٰہی نے اِس شرط کو برداشت نہ کیا، کیونکہ اِس سے ان غریب عوام کی دِل شکنی ہوتی۔

محمد رسول اللہ کی محفل بادشاہوں کی محفل ہو جاتی جہاں اونچ نیچ چلتی ہے اور اِنسانیت میں ظالمانہ تقسیم ہوتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم مِلا کہ اِن سرداروں کی اس شرط کو ٹھکرا دیجئے۔ اِن کو اگر محمدؐ کی محفل میں آنا ہے تو بلال اور عمّار کے ساتھ بیٹھنا ہو گا۔ محمدؐ کے آنے کے بعد اب اِنسانوں کے درمیان کسی قسم کی اونچ نیچ برداشت نہیں ہو سکتی۔ دُنیا کے اِس اِنسانیت نواز رہنما نے ابوجہل اور عتبہ کی اِس مذموم خواہش کو ٹھکرا دیا۔ اور عرب کے اِس مظلوم طبقہ کی عزت بڑھا دی۔[1]

ایک مرتبہ صحابۂ کرام رضؓ نے اپنے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان

---

[1] سورہ انعام رکوع ۶ کی تفسیر میں ابن کثیر نے یہ واقعہ تفصیل سے نقل کیا ہے

امتیازی شان پیدا کرنے کے خیال سے عرض کیا۔ سرکار۔! ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے پانی پینے کے برتن الگ کر دیں، حضور نے ارشاد فرمایا۔

دو نہیں۔ میں اُنہی حوضوں سے پانی پیوں گا جن سے عام مسلمان پانی پیتے ہیں، مجھے اُمید ہے کہ اس پانی سے مجھے برکت حاصل ہوگی جن میں عام مسلمانوں کے ہاتھ پڑتے ہیں عہ۔

دُنیا کے اِس عوامی رہنما نے اپنے لئے اِتنا امتیاز بھی گوارا نہ کیا کیونکہ اِسی قسم کے امتیازات سے چھوت چھات پیدا ہوتی ہے

"غلام انسان" دنیا کا مظلوم ترین انسان ہوا کرتا تھا، عیسائیت کا سلوک اس کے ساتھ وحشیانہ تھا عیسائی آقا اپنے غلام کو قتل کرنے کا حق رکھتا تھا، یہود کے ہاں غلام کو مذہبی کتابیں پڑھنے کا حق نہ تھا۔ ارسطو یونان کا مشہور حکیم ہے وہ کہتا ہے۔ غلام ایک جاندار کھلونا ہے۔

زمانۂ قدیم کی سب سے بڑی مہذب حکومت "روما" کی حکومت تھی اُس حکومت میں غلاموں کو درندوں کے سامنے چھوڑ کر ان کی موت کا تماشہ دیکھا جاتا تھا، باندیوں سے پیشہ کرایا جاتا تھا. غلام کو آزاد ہونے کے بعد بھی شہری حقوق نہیں ملتے تھے۔

عرب کی حالت بھی ایسی ہی تھی، غلام عرب کا اچھوت طبقہ تھا، اِن اچھوتوں کا لباس الگ تھا، اِن کے بیٹھنے اُٹھنے کا طریقہ الگ تھا، اُنھیں

عہ۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ اَرجو برکت ایدی المسلمین

شہری زندگی میں کوئی حق حاصل نہ تھا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس طبقہ پر احسان فرمایا۔ دُنیا سے غلامی کی رسم ختم کرنے کے لئے آپ نے جو انقلابی احکام دیئے ان کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں صرف آپ کی سیرتِ پاک کے اُن چند پہلوؤں کو دکھانا مقصود ہے جس سیرتِ پاک نے غلاموں میں آقاؤں کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کی روح پھونکی اور آقاؤں میں اُخوّت و مساوات کا وہ پاک جذبہ پیدا کیا کہ انھوں نے غلاموں کو اپنے ساتھ کھلانا پلانا اور اپنی اولاد کی طرح رکھنا شروع کر دیا۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سردار تھے، سرداروں کی اولاد تھے مگر آپ غلاموں کی طرح تہبند باندھتے تھے، غلاموں کی طرح اُکڑوں بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے تھے، غلاموں کے ساتھ میل جول رکھتے تھے تاکہ اِس طبقہ سے ذلّت و حقارت کا اِحساس دُور ہو، آپ کے اِس طرزِ عمل سے قریش کے سردار بہت چراغ پا ہوتے تھے مگر آپ اِس کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

سیرتِ ابن ہشام میں لکھا ہے کہ مکہ میں رومی نصرانی غلام تھا یہ جبر نامی غلام لوہار کا کام کیا کرتا تھا اور عبرانی زبان جاننے کی وجہ سے انجیل پڑھ لیا کرتا تھا، حضور اِس غلام میں علم کی روشنی دیکھ کر اِس کے پاس آیا کرتے تھے اِس خیال سے کہ شاید یہ اِسلام قبول کر لے۔ لوگوں نے حضور کو اُس کے پاس آتے جاتے دیکھ کر یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ کہتے ہیں اُسی سے سُن کر اور سیکھ کر کہتے ہیں۔ مقصد اِن مخالفین کا یہ تھا کہ آپ اِس سے میل جول ختم کر دیں، مگر آپ اِس پروپیگنڈے سے مرعوب نہیں ہوئے۔

قرآن کریم میں اِس کا جواب اِس طرح دیا گیا ہے۔

لوگو۔! سوچ سمجھ کر اعتراض کرو، وہ غلام عجمی ہے، یہ قرآن عربی ہے، کیا قرآن جیسا فصیح و بلیغ کلام ایک عجمی غلام تصنیف کر سکتا ہے، وہ قرآن جس نے اہل زبان کو عاجز کر رکھا ہے۔ (ابن کثیر سورۂ نحل صفحہ ۵۸۶)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مساوات اور انسانی برابری کے متعلق حجۃ الوداع کے موقعہ پر خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا۔

اِنَّ اللّٰہ اَذْھب عنکم عیبۃ الجاھلیۃ وَفخرھا بالاٰباءِ انما ھو مومن تقی وفاجرٌ شقی اَلنَّاس کلھم بنواٰدم واٰدم من تراب۔

اللہ تعالیٰ نے تم میں سے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا پر فخر کرنے کو مٹایا انسان اب یا تو پرہیزگار مومن ہے یا بدنصیب گنہگار، تمام آدمی آدم کے بیٹے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں

حضور وطن دوست مہاجر کی حیثیت سے

مکہ کی سرزمین میں توحید کے پرستاروں پر ظلم و ستم کی بارش ہو رہی ہے مخلوق کے سامنے سر جھکانے والوں نے خالق کے پرستاروں کا جینا دوبھر کر دیا ہے، اللہ والے اپنے وطن عزیز سے جانے شروع ہو گئے ہیں۔

ایک گروہ نے سب سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی، وہاں کے انصاف پسند مسیحی بادشاہ نے انھیں پناہ دی، دوسری طرف مدینہ طیبہ کی قدر شناس سرزمین نے

مسلمانوں کے لئے اپنے دروازے کھول دیئے اور اب مظلوم مسلمان مدینہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔

اِن اللہ والوں میں کوئی ایسا نہیں جو وطن کی فطری محبت کے جذبہ سے خالی ہو مگر حق کی خاطر انھوں نے وطن کی جدائی کا پتھر کلیجہ پر رکھ لیا ہے

حق کے دشمن سمجھتے تھے کہ وطن سے بے وطن ہو کر ان اللہ والوں کو کسی جگہ پناہ نہ ملے گی، لیکن حبشہ اور مدینہ نے جس طرح مہاجرین کو گلے سے لگایا اُس سے قریش کا غصّہ اور زیادہ بڑھ گیا۔

اب قریش کے سردار ہادی اِسلام کے خلاف ظلم کی آخری تجویزیں سوچ رہے ہیں، مکّہ کے پنچایت گھر میں بڑے چھوٹے سب جمع ہیں، کوئی کہہ رہا ہے ــــ ــــ رسولِ پاک کے پیروں میں زنجیریں ڈال کر انھیں کسی مکان میں ہمیشہ کے لئے قید کر دو"۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور اُس نے کہا "محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم "کو جلا وطن کر دو۔

سب کی تقریریں سنکر ابو جہل کھڑا ہوا ــــ اِس ملعون کی آنکھوں میں غصّہ کی سرخی بھی ہے اور ندامت کا جھکاؤ بھی، غصّہ بتلا رہا ہے کہ یہ ہادی اِسلام کو ختم کرنے کا اِرادہ رکھتا ہے، ندامت کہہ رہی ہے کہ اِس شخص نے ظلم کرنے میں اب تک کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، اُس نے سارے جتن کئے مگر ناکام رہا۔ اور ذلیل ہوا، اِس بدبخت کی زبان رسول پاک کے خلاف آگ برسا رہی ہے، مگر اُس کا ضمیر اس پر ملامت کر رہا ہے۔

تیرہ سال کی مخالفت کے دوران کئی موقعے ایسے آچکے ہیں جبکہ رسول برحق

کی صداقت نے اُس کے ضمیر کو اپنا معترف کیا مگر یہ بڑا ڈھیٹ ہے اس نے اپنے ضمیر کو دبایا اور ضمیر کی آواز کو اُبھرنے نہ دیا۔

ابوجہل نے کھڑے ہو کر مجلس شوریٰ میں یہ تجویز پیش کی ۔۔ محمدؐ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کو قتل کر دیا جائے اور قصاص و بدلے سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ ہر قبیلہ اپنا ایک آدمی دے اور یہ تمام آدمی ملکر ایک ساتھ محمد (رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) پر حملہ کر کے قتل کر دیں۔ بنی ہاشم کو تمام عرب کے قبیلوں سے لڑنے کی ہمت نہ ہوگی۔

مکہ کی مجلس شوریٰ میں ابوجہل کی یہ تجویز منظور ہو جاتی ہے، اِدھر یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو قتل کی تجویز سے آگاہ کر کے ہجرت کا حکم دیدیتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیق خاص حضرتِ ابوبکر رضؓ کو ساتھ لے کر مکہ سے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور وطنِ عزیز کو خیرباد کہتے وقت وطن کا یہ فرزند جلیل مکہ کے در و دیوار کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے اور مکہ کو خطاب کر کے کہتا ہے۔

اے مکہ تو کتنا پاکیزہ ہے اور مجھے کتنا پیارا ہے اگر تیرے نالائق باشندے مجھے نکلنے پر، مجبور نہ کرتے تو میں تجھ کو ہرگز چھوڑ کر نہ جاتا۔۔۔۔۔۔ ؎۱

وہ سرزمین جو اس وقت شرک و ظلم سے گندی ہو رہی ہے اُسے دنیا کا

؎۱ ترمذی شریف کے الفاظ یہ ہیں۔ ما اطیبکِ بلدٍ و اَحَبُّکِ

سب سے زیادہ پاک انسان "پاک اور" محبوب" کہہ رہا ہے، یہ وطن کی طبعی محبت کا اظہار ہے اور اس امر کا اعلان ہے کہ وطن کی محبت اسلام اور خدا پرستی کے خلاف نہیں ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دشمنوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر مکہ سے نکل گئے۔ خون کی پیاسی تلواریں ناکام ہو گئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ پہنچ گئے

مدینہ طیبہ کی سرزمین نے رسولِ برحق کا اُن کی شایانِ شان خیر مقدم کیا مدینہ والوں نے جس جاں نثاری کا وعدہ کیا تھا وہ اپنی جان ومال سے اس وعدہ کو پورا کر رہے ہیں لیکن کیا رسولِ برحق کے دل سے وطنِ عزیز کی محبت کا جذبہ نکل گیا ہے۔۔۔۔

مدینہ نے یقیناً آپ کو بڑے پیار سے رکھا مگر اس کے باوجود جس وطن میں تکلیفیں اُٹھائیں اس کی محبت آپ کے دل سے نہ نکلی۔ رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دل میں وطن عزیز میں واپس جانے کے لئے بے قراری تو تھی جس پر قرآن کریم نے آپ کو اطمینان دلایا تھا اور آپ کے دل بے قرار کو تسلی دیتے ہوئے یہ وعدہ فرمایا تھا۔

اِنَّ الَّذِی فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْآنَ لَرَادُّکَ اِلٰی مَعَادٍ

سورہ

وہ ذات جس نے آپ پر اے رسول! قرآن کے احکام پر پابندی اور تبلیغ کو فرض قرار دیا ہے وہی ذات آپ کو یقیناً مکہ کی طرف لوٹانے والی ہے۔

یہ مکہ واپس لے جانے کا وعدہ کیا ہے، یہ دلِ بے قرار کے لئے تسلی کا پیغام نہیں تو کیا ہے ؟

وطن سے آنے والے مسافر وطن سے دور افتادہ لوگوں کے دل میں کس طرح وطن کی یاد کو تازہ کر دیتے ہیں اس کی کتنی اچھی مثال ہے رسولِ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی کے حسب ذیل واقعہ میں۔

حضرت اُصیل غفاری مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے دولت خانۂ رسول پر حاضر ہوئے ام المومنین نے پوچھا — اصیل مکہ کو کس حال میں چھوڑا — ؟ حضرتِ اصیل رض نے کہا۔

صدیقہ — ! میں نے اپنے وطن کو اس حال میں چھوڑا کہ اس کے پھل پھول تر و تازہ ہیں — اُس کی چٹانیں روشن ہیں — اس کی لمبی لمبی گھاس لہلہاتی ہے۔

حضور ص نے جناب اصیل رض کے اس جواب کو سنا۔ جناب اصیل کے جملوں سے وطن کی یاد ٹپک رہی تھی، وطن کی محبت جھلک رہی تھی، آپ نے ضرورت سمجھی کہ جناب اُصیل کو تسلّی دیجائے۔ ارشاد فرمایا۔

اصیل وطن کی اتنی یاد بس کافی ہے غم نہ کرو —— !

یعنی اگر تمھارے دل میں وطن عزیز کی محبت موجود رہے گی تو اللہ تعالیٰ تمھیں ایک دن وہاں واپس لے جائے گا، بے کسی میں وہاں سے آئے ہو۔ طاقتور ہو کر وہاں داخل ہو گے۔

حضرت عمر رض کا قول ہے۔ لولا حب الوطن لخرب بلاد السوء

لوگوں کے دلوں میں اگر وطن دوستی کا جذبہ نہ ہوتا تو خراب شہر ویران ہو جاتے گاؤں میں رہنا کون پسند کرتا۔ ہر شخص شہروں کی چمک دمک کی طرف دوڑتا۔ (روح البیان جلد ۲۰ ص ۴۲)

رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وطن دوستی کے جذبے کو بہت عزیز رکھا، خود اس جذبے سے سرشار رہے لیکن اس پاک جذبہ کو معقول حدوں سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

وطن کی محبت کا جذبہ جب معقول حدوں سے آگے بڑھ جاتا ہے تو یہ مستقل فتنہ بن جاتا ہے، انسان اس فتنہ میں اندھا ہو کر انصاف اور انسانیت کی قدروں کو پامال کرنے لگتا ہے لیکن رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انسانیت اور حق وانصاف کو بہر حال سب سے آگے رکھا اور وطن کی قربانگاہ پر انسانیت کو بھینٹ نہیں چڑھایا۔

مکہ فتح ہو چکا ہے، وطن عزیز سے آیا ہوا مہاجر اپنے وطن میں فاتح کی حیثیت سے موجود ہے، آج مکہ پر اسلام کا پورا اقتدار قائم ہے، دنیا خیال کر رہی ہے کہ جس ذات اقدس نے مجبور ہو کر مکہ چھوڑا تھا وہ اب مکہ ہی کو اپنے قیام سے رونق بخشے گی، آج سے مکہ مدینہ کی جگہ لے لے گا اور اسلام کی راجدھانی بنے گا، لیکن دنیا نے دیکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینہ کی طرف واپس لوٹ رہے ہیں اور اسلام کی راجدھانی بننے کا جو شرف مدینہ کو حاصل ہو چکا آپ اس شرف سے مدینہ کو محروم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے کیونکہ یہ احسان فراموشی ہے، مدینہ نے اس وقت حق کا ساتھ دیا تھا جب ہر طرف سے

مخالفت کے تیر برس رہے تھے۔

طائف کی غنیمت کی تقسیم پر ایک عجیب واقعہ تاریخ اسلام نے ہم کو عطا کیا ہے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مال غنیمت کی تقسیم میں سے قریش کے نومسلم سرداروں کو بڑی فراخدلی سے انعام و اکرام عطا فرمائے۔ انصار کرام کے چند نوعمر لڑکوں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی داد و دہش پر کہا "حضورؐ نے اپنوں کے ساتھ بڑی رعایت کی ہے حالانکہ ہماری تلواروں سے ابھی تک اُن کا خون ٹپک رہا ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک اُن لڑکوں کی بات پہنچی تو آپ نے صحابۂ کرام رضؓ کو جمع کیا اور نوجوانوں نے جو بدگمانی کرتے ہوئے کہا تھا اس پر فرمایا۔

"میں نے قریش کے سرداروں کو غنیمت کا مال اس لئے زیادہ دیا ہے تاکہ ان کی دلجوئی ہو جائے یہ نومسلم ہیں، اُن کے دل میں طرح طرح کے خدشات ہیں، میں نے اُن پر احسان کر کے اُن کے دلوں کی تالیف کی ہے۔"

لوگو۔۔۔! کیا تم اس کو پسند نہیں کرتے کہ لوگ مال و دولت لے کر اپنے گھروں کو واپس جائیں اور تم مجھ کو اپنے ساتھ لے کر مدینہ واپس چلو ٹھیک ہے۔۔۔! خوش نصیب وہ نہیں تھے جو دولت لے کر خوش و خرم ہوئے، خوش نصیب تو وہ تھے جو محبوب رب العٰلمین کو اپنے جلو میں ساتھ لئے مدینہ کی طرف جا رہے تھے اور مکہ کا ایک ایک ذرہ حسرت بھری نگاہوں سے اپنے عظیم فرزند کو دیکھ رہا تھا، تاہم وطن سے محبت ہوتی ہے اور اگر انسان اپنے وطن سے کسی بھی وجہ سے دور چلا جائے تو وطن کی محبت باقی رہتی ہے۔

اور یہ محبت انہی محبتوں میں سے ایک ہے جو انسان کی فطری و بشری محبتیں ہیں اور اِسی لئے اِسلام نے بھی اِس کی اجازت دی ہے اور وطن کے لئے جذبۂ محبت کا احترام کیا ہے۔

حضورؐ خوش مذاق دوست کی حیثیت سے

انسان مختلف جذبات کے مجموعہ کا نام ہے ایک وقت وہ عبادت خانہ میں بیٹھ کر خدا کو یاد کرتا ہے، مصلّے پر بیٹھ کر روتا ہے، عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر عظمت و وقار کا مظاہرہ کرتا ہے تو ایک وقت وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ دوستوں میں بیٹھ کر ہنسے بولے، دو چار لمحے زندہ دلی شگفتگی اور بے تکلفی کے ساتھ گزارے ـــــ یہ انسان کی فطرت کا اٹل تقاضا ہے۔

اس لئے ضروری تھا کہ جب ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں عبادت اور عدالت کی مکمل رہنمائی موجود تھی، اس کی پاک زندگی میں ہنسنے بولنے اور شریفانہ مزاح کا نمونہ بھی موجود ہو اور وہ پاک نمونہ فطرت انسانی کی رہنمائی کرے اور لوگ بیہودگی اور چھچھورپن کو مزاح سمجھ کر انسانی شرافت کو بدنام نہ کریں۔

سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پہلے دنیا اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی تھی کہ " اللہ والے آدمی رونی صورت، خشک طبیعت اور کھرے مزاج ہوتے ہیں، وہ نہ کبھی ہنستے ہیں اور نہ ہنسنے کو اچھا سمجھتے ہیں۔

رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اِس تصوّر کو غلط قرار دیا اور اپنے اُسوۂ پاک سے دنیا کو یہ بتلایا کہ ایک اِنسان سب سے بڑا اللہ والا ہوتے ہوئے بھی اپنے ساتھیوں سے ہنستا بولتا ہے، خوش طبعی سے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا دِل بہلاتا ہے، غم غلط کرتا ہے۔

غور کیجئے، ہنس مکھ پیغمبر کی زندگی کا یہ رُخ کس قدر پُرکشش ہے، حضور کے ایک صحابیؓ تھے جن کا نام زاہر رضی اللہ عنہ تھا۔ یہ دیہات میں بود و باش رکھتے تھے، شکل و صورت کے اچھے نہ تھے مگر حضور اُن سے بڑی محبت فرمایا کرتے تھے اور ارشاد فرمایا کرتے تھے ــــــ "ہر شہری کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے والا ایک دیہاتی ہوتا ہے اور آلِ محمدؐ کی یہ ضرورت زاہرؓ پوری کرتے ہیں۔

حضرت زاہر رضی اللہ عنہ حضور کی خدمت میں دیہات کی سبزیاں وغیرہ پیش کیا کرتے تھے اور حضور ان کے بال بچوّں کے لئے شہری سامان عطا فرماتے تھے۔ ایک دن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بازار پہنچے حضرت زاہرؓ کو دیکھا کہ بازار میں دوکان لگائے سودا بیچ رہے ہیں، حضور کو اس وقت کچھ پیار آگیا، پیچھے گئے اور دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

زاہرؓ بولے ــــــ کون ہے؟ مجھے چھوڑ دو۔" حضورؐ نے نہ چھوڑا۔ زاہرؓ نے کچھ لمحوں کے بعد سمجھ لیا کہ محبوبِ خدا ہیں۔ تو اب حضرت زاہر نے چھڑانے کی بجائے خود حضور سے چمٹنا شروع کر دیا، سینۂ اقدس سے اور قریب ہونے لگے۔ حضور سمجھ گئے کہ زاہرؓ مجھے پہچان گئے ہیں۔

اب آپ نے محبت بھرے لہجہ میں ارشاد فرمایا۔

مَنْ یشتری ھٰذا العبد ؟ اِس غلام کو کون خرید تا ہے ——؟

زاہر بولے —! خدا کی قسم یہ مال تو بہت کھوٹا اور خراب ہے۔

حضور نے ارشاد فرمایا۔ زاہرؓ تم خدا کے نزدیک تو بہت قیمتی مال ہو،

— سبحان اللہ! کس انداز سے غلام کی عزت افزائی فرمائی۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پھوپی جان حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں اور درخواست کی حضور —!

اُدْعُ اللہ اَنْ یَّدْخلنی الجنۃ میرے لئے دعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ مجھے جنت میں داخل کر دے۔

حضور نے ارشاد فرمایا —— پھوپی جان ——!

ان الجنۃ لا یدخلھا عجوز کوئی بڑھیا تو جنت میں داخل نہیں ہو گی

یہ سُنکر حضرت صفیہ رضؓ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ مغموم ہو کر چلنے لگیں، حضور نے صحابہ سے فرمایا ——! اِن بزرگوار سے کہدو۔ کوئی بڑھیا بڑھاپے کی حالت میں جنت میں داخل نہیں ہو گی۔ بلکہ خدا تعالیٰ اُسے ایک نئی زندگی کے ساتھ جنت میں داخل فرمائے گا۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت صفیہ سے مزاح کے طور پر یہ جملہ فرمایا تھا، مگر یہ جملہ مزاح کا مزاح تھا اور حقیقت کی حقیقت، حضرت صفیہ رضؓ اِس بات کو نہ سمجھ سکیں اور رونے لگیں، تب حضورؐ نے اس حقیقت کو واضح فرمایا اور ارشاد فرمایا۔

اللہ تعالیٰ ہر شخص کو تیس سال کا جوان بنا کر جنت میں داخل فرمائے گا۔

——— اور اپنی دلیل میں یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔

اِنَّآ اَنْشَأْنٰھُنَّ اِنْشَآءً — ہم نے اُٹھایا اُن عورتوں کو
فَجَعَلْنٰھُنَّ اَبْکَارًا عُرُبًا اَتْرَابًا — اچھے اُٹھان پر، پھر کیا کنواریاں،
(واقعہ) — پیار کرنے والیاں، عمر میں برابر والی۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ خادم رسول اللہ کہلاتے ہیں اور بچپن ہی سے حضور کی خدمت میں رہے وہ فرماتے ہیں :۔ رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہم سب کے ساتھ خوش طبعی فرمایا کرتے تھے، چنانچہ میرا ایک بھائی کبشہ تھا، اُسے لال دسرخ چونچ کی) چڑیا پالنے کا بہت شوق تھا، اتفاق سے اس کا ایک لال مر گیا، حضور کو معلوم ہوا کہ کبشہ بہت رنجیدہ ہے آپ نے اُس کا صدمہ دُور کرنے کے لیے اُس سے مزاح فرمایا! ورارشاد فرمایا۔

یا ابا عمیر ما فعل النغیر؟ — ابو عمیر! تمھارے لال کا کیا حال ہے؟

یہ سُنکر بچّہ باغ باغ ہو گیا اور آقا کے مزاح نے اُس کا غم غلط کر دیا۔

یہ تینوں واقعات شرح شمائل ترمذی للبیجوری صہ ۱۳۳ و ۱۳۴ سے لئے گئے ہیں۔

رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اِسی شگفتہ مزاجی کی وجہ سے صحابۂ کرام کا دل بھی آپ سے کھُل گیا تھا، اِن غلاموں کے دِل میں آقا کی پوری عظمت تھی مگر وہ با ادب غلام اپنے محترم آقا سے کبھی کبھی مزاح کر لیا کرتے تھے۔

غزوہ تبوک میں حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک چھوٹے سے

خیمہ میں رونق افروز تھے ایک صحابیؓ حاضر ہوئے، حضور نے دیکھ کر فرمایا۔ اندر آجاؤ۔

وہ بولے ـــ سرکار! پورا آجاؤں۔؟ یعنی پورے جسم کے ساتھ آجاؤں؟، حضور۔ ہنس دیئے۔

صحابی رضؓ کے جملہ میں نہایت لطیف تعریض تھی یعنی خیمہ تو اتنا چھوٹا ہے، اور آپ مجھے اندر بُلا رہے ہیں۔

ایک روز حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی پاک سیرت بیوی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ارشاد فرمایا۔

عائشہ اگر تم مجھ سے پہلے مرجاؤ تو اس میں تمھارا کیا حرج ہے؟ فائدہ ہی فائدہ ہے، ـــ میں تم کو اپنے ہاتھوں سے غسل دوں گا، کفناؤں گا، جنازہ کی نماز پڑھاؤں گا اور اپنے ہاتھوں سے دفن کروں گا۔

حضرت عائشہ رضؓ حضور کے اس لطیف مذاق پر (بظاہر بگڑ کر) بولیں ـــ جی ہاں ـــ یہ سب کچھ تو آپ کریں گے ـــ مگر یہ بھی ہوگا کہ آپ اُسی دن میرے حجرے میں اپنی دوسری بیوی کے ساتھ آرام فرمائیں گے ـــ حضور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں آپ پر دوبھر ہو گئی ہوں۔

حضورؐ حضرت صدیقہ کی پُر مزاح خفگی بھرے جواب پر ہنس پڑے۔

پھول سے زیادہ شگفتہ دل پیغمبرؐ نے پاکیزہ اور ستھرے مزاح کی مثال قائم کرتے ہوئے اُمت کو متنبہ فرمایا۔

لیس المومن بالطعانِ ـــ وہ شخص کامل مسلمان نہیں جو طعن و تشنیع کرے۔

وَلَا اللعانِ وَلَا الفاحش وَلَا البذی (ترمذی)
دوسروں پر لعنت بھیجے، بد زبانی اور فحش کلامی کرے۔

یعنی بیہودہ مذاق اور چھچھورپن مومن کی شایانِ شان نہیں اور ستھرا مذاق اور سنجیدہ مزاح پیغمبر علیہ السلام کی سنّت ہے۔

احادیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سیر و تفریح کی غرض سے باغ میں تشریف لے جایا کرتے تھے اور جب آپ کے صحابہؓ آپ کو تلاش کرتے ہوئے اُس باغ میں نکل آتے تھے تو آپ سیر و تفریح میں بے تکلفی میں اور خوش علیشی میں اُن کو اپنے ساتھ شریک فرما لیا کرتے تھے، ایسا نہیں ہوتا تھا کہ غلاموں کے آجانے سے آقا کی طبیعت میں تکدّر پیدا ہو جاتا ہو اور آپ بے مزہ ہو جاتے ہوں

بڑوں کی تفریح چھوٹوں کے آجانے سے بے لطف ہو جاتی ہے، مزا کر کرا ہو جاتا ہے، مگر ہمارے آقا ایسے بڑے تھے جو اپنے غلاموں اور نیاز مندوں کے ساتھ بھی پوری دلچسپی کے ساتھ تفریح کا لطف حاصل فرمایا کرتے تھے کیونکہ آپ کی بڑائی بناوٹی بڑائی نہ تھی بلکہ حقیقی عظمت تھی، کردار کی بڑائی تھی، اخلاق کی بڑائی تھی، جو چھوٹے کے ساتھ رل مل کر بیٹھنے اُٹھنے سے کم نہیں ہوتی تھی، زیادہ ہوتی تھی۔

آپ کے مزاح کی حکمت

اِن واقعات کے مطالعہ سے قارئین کو ایک شبہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ ایک باوقار اور متین سید و سردار کے لئے ہنسی مذاق کرنا کہاں مناسب تھا؟

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے واقعہ کو دیکھو۔

قَالُوْا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ آپ کی اُمت نے کہا، تم ہمارا مذاق اُڑاتے ہو۔ (بقرہ)

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں ارشاد فرمایا

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ خدا کی پناہ! کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ (بقرہ)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مذاق اڑانے کو جہالت فرمایا۔

یہ ٹھیک ہے، مزاح اگرچہ مذاق سے بہت زیادہ لطیف ہوتا ہے مگر بہر حال وہ مزاح ہے پھر ایک باوقار رسول کی طرف اُس کا انتساب کیسے مناسب ہو سکتا ہے۔

حضرت تھانوی رح کا ایک واقعہ اِس سلسلہ میں قابل ذکر ہے، اِس واقعہ میں اِس شبہ کا جواب دیا گیا ہے

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک روز میں نے خواب میں دیکھا کہ انگلستان کی ایک شہزادی اِسلام پر ایک اعتراض کر رہی ہے۔ وہ کہہ رہی ہے کہ "پیغمبرِ اِسلام مزاح فرمایا کرتے تھے اور مزاح کرنا متانت کے خلاف ہے۔ اور متانت نبوت کے لئے لازم ہے"

میں نے خواب میں اِس کا جواب دیا اور کہا "آپ مزاح ضرور فرمایا کرتے تھے، لیکن مزاح برائے مزاح نہیں ہوتا تھا، بلکہ ایک دینی مصلحت کے

تحت ہوتا تھا اور وہ حکمت یہ تھی کہ حضورؐ کو حق تعالیٰ نے ذاتی رعب و دبدبہ عطا فرمایا تھا، آپ پر ایسی ہیبتِ حق برستی تھی کہ آنے والا اجنبی آپ کو دیکھ کر تھرّا جاتا تھا، اُس کا حوصلہ نہ پڑتا تھا کہ آپ کے قریب آئے، اِس دبدبہ کا تقاضہ تھا کہ لوگ آپ سے مانوس نہ ہوں اور تبلیغ دین کو نقصان پہونچے، کیونکہ تبلیغ اور تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ لوگ داعی اور معلّم سے مانوس ہوں؟ اُس کے پاس بیٹھیں اُٹھیں، دِل کی بات کہیں، دُکھ درد کی کہانیاں سُنائیں پس حضور مزاح کر کے اُنھیں بے تکلف بنایا کرتے تھے۔ آپ کے مزاح فرمانے سے لوگوں کے دلوں سے وہ رُعب کم ہو جاتا تھا! ور صحابہ کرام اِس طرح آپ کی خدمت میں آیا جایا کرتے تھے جس طرح اولاد اپنے مشفق باپ کی خدمت میں آیا جایا کرتی ہے۔

مولانا فرماتے ہیں۔ "میرے اِس جواب سے وہ شہزادی مطمئن ہو گئی مولانا کا یہ جواب علمی نقطۂ نگاہ سے نہایت معقول تھا اور حضور کے مزاح فرمانے کی بہترین مصلحت یہی ہوتی تھی۔

حضورؐ ایک اُولوالعزم داعی کی حیثیت سے

خدا کے آخری رسول چالیس سال کی عمر میں نبوّت سے سرفراز ہوئے، نبوت کے بعد تین سال تک آپ نے خاموشی کے ساتھ توحید پھیلائی چوتھے سال آپ کو یہ حکم ملا۔ فاصدع بما تومر (سورہ حجر) اور آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اُسے علی الاعلان سُنا دیجئے۔

اب آپ نے دعوتِ عام کا سلسلہ شروع فرمایا، کبھی صفا پہاڑ پر چڑھ کر قریش کو پکارا اور فرمایا۔ لوگو۔! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکر آرہا ہے تو کیا تم کو یقین آئے گا۔؟ سب نے کہا، ضرور یقین آئے گا کیونکہ ہم نے تمہیں کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا۔ تو پھر میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم خدا کی وحدانیت پر ایمان نہ لاؤ گے تو تم خدا تعالیٰ کے عذاب سے ہلاک ہو جاؤ گے۔ خدا کی توحید اور آخرت کا نام سُنکر لوگ بگڑ گئے، مجمع میں سے ابو لہب اُٹھا اور بھتیجے کو بُرا بھلا کہتا ہوا چلا گیا پھر سارا مجمع منتشر ہو گیا۔

اِس واقعہ کے بعد ایک دن حضور نے اپنے چچا زاد بھائی علیؓ سے کہا۔ قریش کے سرکردہ لوگوں کی دعوت کا انتظام کرو، حضرت علی نے دعوت کا اِنتظام کیا۔ خاندانِ عبدالمطلب کو بُلایا گیا، حمزہؓ، ابو طالب، حضرت عباسؓ دعوت میں شریک تھے، خاطر مدرات کے بعد حضور کھڑے ہوئے، قرآن کریم کی تلاوت فرمائی اور پھر ارشاد فرمایا۔

یا اَیُّھَا النَّاسُ قولوا لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ حتی تطیعکم العرب وَتدین لکم العجم	لوگو۔۔۔۔! خدا کی توحید کا اقرار کرو تاکہ عرب و عجم تمہاری فرمانبرداری کرنے لگے۔

یعنی مجھے خدا تعالیٰ نے وہ نظامِ زندگی عطا فرمایا ہے کہ اگر تم اس کی اطاعت قبول کر کے اُسے اپنا لو تو عرب و عجم تمہاری فرمانبرداری پر فخر کرنے لگیں۔

حضور کی تقریر سنکر مجلس پر سناٹا چھا گیا، کسی میں ہمت رکھی تھی کہ لبیک کہتا۔ خدا نے توفیق دی تو ایک نو عمر لڑکے یعنی ابو طالب کے

لختِ جگر کو دی، وہ کھڑا ہوا اور اپنے بڑے بھائی سے عرض کیا۔

"بھائی صاحب :-! گو میری آنکھیں دُکھ رہی ہیں، میری ٹانگیں پتلی پتلی ہیں، میری عمر سب سے کم ہے، مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کی اطاعت کروں گا اور آپ کا ساتھ دوں گا۔"

قوم کے بزرگوں نے یہ منظر دیکھا اور سب بے ساختہ ہنس پڑے، اِس خیال سے کہ کہاں عالمگیر انقلاب کے یہ بلند ارادے، دنیا میں نظامِ حق قائم کرنے کے منصوبے اور کہاں "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اُس کے ساتھ صرف ایک لڑکا ــــ لوگ تو اس بات پر ہنسی اُڑا کر چلے گئے مگر قدرت نے پکار کر کہا۔ یہ نبی کی آواز ہے ــــ آخری نبی کی، حق قائم ہو کر رہے گا۔ تم ساتھ دو یا نہ دو۔ (تفسیر کبیر جلد پنجم ص ۵۹۹)

اب داعیِ حق کی مخالفت شروع ہوئی، لیڈروں کو اپنی خدائی کا طلسم ٹوٹتا نظر آیا، مذہبی عظمت کے پردوں میں چھپی ہوئی بداخلاقیوں اور بدچلنیوں کی پول کھلنے لگی، خدا کے کمزور بندوں کا خون چوسنے والی جونکیں ــــ ابوجہل ابولہب، اُمیہ بن خلف، ولید بن مغیرہ ــــ جیسے ظالم سردار میدان میں نکل آئے۔ یہ دیکھئے ــــ! خدا کے پیارے رسول حرم میں نماز پڑھ رہے ہیں، کعبہ کے جھوٹے ٹھیکہ دار صحنِ کعبہ میں بیٹھے ہیں، ابوجہل حضور کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر آگ بگولا ہوجاتا ہے، لوگوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے ــــ کاش تم میں سے کوئی شخص اونٹ کا ایک گندا اوجھ لے آئے اور جب محمد سجدہ میں جائے تو اس کی گردن پر رکھدے، ــــ عقبہ سردارِ قوم کی آواز پر کھڑا ہوجاتا ہے

اونٹ کا اوجھ لا کر محبوبِ حق کی گردن پر ڈال دیتا ہے، خدا کے دشمن اس تماشے کو دیکھ کر ہنس پڑتے ہیں، وحشت اس قدر غالب ہوتی ہے کہ ہنسی میں لوٹ پوٹ ہو کر ایک دوسرے پر گر پڑتے ہیں، کوئی خدا کا نیک دل بندہ اس افسوسناک تماشے کو دیکھتا ہے، ظالموں کے مقابلہ پر آنے کی ہمت تو نہیں کر سکتا تھا، بھاگا ہوا رسولِ پاک کے گھر والوں کو خبر دیتا ہے، چھوٹی بیٹی جنابہ سیدہ زہرا رضؓ اُس وقت صرف پانچ برس کی ہیں، پانچ برس کی لڑکی کی بساط کیا ہوتی ہے مگر باپ کی محبت کے جوش میں دوڑی دوڑی حرم میں آتی ہیں اور ننھے ننھے ہاتھوں سے گندا اوجھ ابا جان کی گردن کے اوپر سے ہٹاتی ہیں اور تو کیا کر سکتی تھیں پاک زبان سے بد دعائیں دیتی ہوئی واپس ہو جاتی ہیں۔

یہ ابولہب ہے، حضور کا چچا ہے، ایک وقت وہ تھا اس نے اس بھتیجے کی پیدائش کی خوشی میں ایک لونڈی کو آزاد کر دیا تھا ایک وقت یہ ہے کہ یہ بدبخت اس بھتیجے کا جانی دشمن بنا ہوا ہے، حضور کے ساتھ لگا رہتا ہے، حضور وعظ فرماتے ہیں اور یہ ساتھ ساتھ کہتا جاتا ہے۔ لوگو۔۔! یہ شخص جھوٹا ہے، دیوانہ ہے اس کی ایک بات نہ سنو۔۔!۔۔ یہ خون کے رشتوں کا حال تھا، جہاں خون کے رشتوں میں آگ لگی ہوئی ہو وہاں غیروں سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔

ابوجہل کا یہ حال ہے کہ جہاں کہیں خدا کے رسول کو تقریر کرتے ہوئے دیکھتا ہے دوڑ کر آپ کے پاس آ جاتا ہے، جب تک آپ تقریر کرتے رہتے ہیں یہ خاک دھول اڑاتا رہتا ہے تاکہ لوگ اکٹھے نہ ہوں اور یہ کہتا رہتا ہے، اس شخص کے دھوکے میں نہ آنا یہ شخص تم سے لات وعزیٰ کی پوجا چھڑوا دے گا۔

ایک دردناک منظر اور دیکھو۔ ! رسولِ برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لے جا رہے ہیں، ایک گستاخ جسارت کر کے آپ پر مٹی ڈال دیتا ہے آپ اس حالت میں گھر لوٹ آتے ہیں، بیٹی دیکھتی ہیں تو دوڑ کر ابا جان کے پاس آتی ہیں، ابا جان کو خاک آلودہ دیکھ کر پانی لاتی ہیں اور حضورؐ کا سر دھلانے بیٹھ جاتی ہیں اور سر دھوتی جاتی ہیں، ابا جان بیٹی کو روتا دیکھ کر فرماتے ہیں۔ "جانِ پدر"۔! مت رو، خدا تیرے باپ کو بچالے گا۔

طائف کا تبلیغی سفر بھی داعی حق کی زندگی کا بڑا عبرت انگیز واقعہ ہے طائف عرب کے دولت مندوں کی نہایت حسین اور پُر فضا بستی تھی، حضورؐ تبلیغ حق کے لئے اِس بستی میں تشریف لے گئے، بستی کے سرداروں سے گفتگو فرمائی، اِن مغروروں نے نہایت دِل آزارانہ جواب دیئے، بستی کے غنڈوں کو بلایا اور اِن کو حکم دیا کہ۔ محمد ! باپ دادا کے دین کے خلاف ایک دین پھیلانے آیا ہے، اِس کو ایسی سزا دو کہ یہ آئندہ اِس بستی کا رُخ نہ کرے، بستی کے آوارہ لوگ اپنے آقاؤں کا اِشارہ پا کر نمک حلالی کے لئے میدان میں نکل آئے۔

خدا کے پیارے رسول ہیں اور آپ کے جاں نثار غلام حضرت زید ہیں بستی میں دونوں طرف آوارہ لوگوں کی قطاریں کھڑی ہوئی ہیں، سرکارؐ بیچ میں سے گزر رہے ہیں، کوئی تالیاں بجا رہا ہے، کوئی قہقہہ لگا رہا ہے، کبھی کسی جانب سے پتھر آنے لگتے ہیں، ——— حضور اپنے غلام کے ساتھ شرافت کے ساتھ سر جھکائے ہوئے چلے جا رہے ہیں، مگر اِس شرافت پر

بھی کسی کو رحم نہیں آتا، پتھر برابر برس رہے ہیں، قہقہے مسلسل بلند ہو رہے ہیں۔

رسول برحق کی پنڈلیاں زخمی ہو گئی ہیں، جوتیاں خون سے لبریز ہیں، جنہیں آپ کے مبارک قدم جم گئے ہیں۔

پھر دیکھو۔۔۔! اس پر بھی بس نہیں ہے، خدا کے پیارے رسول اگر زخموں کی تکلیف سے بیٹھ جاتے ہیں تو یہ ظالم آپ کے شانے پکڑ کر پھر کھڑا کر دیتے ہیں انھیں رحمتِ عالم کا بستی میں ایک منٹ ٹھہرنا بھی گوارا نہیں ہے، لیکن کیسے سنگ دِل ہیں یہ لوگ، جب آپ جانے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو پھر پتھراؤ شروع کر دیتے ہیں ــــــ مدنی آقا اسی حالت میں چلتے رہتے ہیں یہانتک کہ سامنے انگوروں کا ایک باغ نظر آجاتا ہے، آقا اور غلام دونوں اس باغ میں چلے جاتے ہیں یہ باغ ایک نیک دل انسان عتبہ کا تھا، جو آپ کو اس میں پناہ مل گئی ورنہ اس وقت طائف کی سرزمین میں محمد ؐ کے لئے پناہ کی کوئی جگہ نہ تھی،

عتبہ غیرت مند انسان تھا، اُس نے آپ کو جب اس حال میں دیکھا اپنے غلام کو آواز دی اور اس کے ہاتھ سرکار کی خدمت میں انگوروں کا ایک خوشہ کشتی میں لگا کر بھیجا۔

پہلو میں اگر انسانی دل رکھتے ہو تو سوچو! اس وقت سرکار کے دِل پر کیا گزر رہی ہو گی۔ ــــ اس میں کیا شک ہے کہ آپ سب سے بلند ہمت اور عالی حوصلہ رسول تھے، ــــ مگر پھر بھی آمنہ کے جائے اور عبداللہ کے لختِ جگر یعنی ابن آدم اور انسان تھے، انسانی جذبات اور احساسات سے آپ کا قلبِ مبارک خالی نہ تھا، اس موقعہ پر آپ اپنے خدا سے اِس ظلم و زیاتی کے خلاف

جتنی فریاد کرتے تھوڑی تھی بگر جہاں آپ کو یہ حق حاصل تھا وہاں یہی موقعہ آپ کی رحمتہ للعالمینی کے امتحان و آزمائش کا بھی تھا۔

تاریخ میں آتا ہے کہ آپ نے اس موقعہ پر یہ دُعا فرمائی

"اے اللہ تجھ سے شکایت کرتا ہوں اپنی کمزوری اور بے کسی کی اور لوگوں میں ذلت و رسوائی کی۔

اے ارحم الراحمین تو ہی ضعیفوں کا رب ہے اور تو ہی میرا پروردگار ہے۔۔ تو مجھے کس کے حوالے کرتا ہے۔۔ کسی اجنبی بے گانے کے جو مجھے دیکھ کر ترش رُو ہوتا ہے اور منہ چڑھاتا ہے یا کسی ایسے دشمن کے جس کو تو نے مجھ پر قبضہ دیدیا ہو۔

اے اللہ۔! اگر تو مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے، تیری حفاظت میرے لئے کافی ہے۔

میں تیرے چہرے کے اُس نور کے طفیل جس سے تمام اندھیریاں روشن ہو گئیں اور جس سے دنیا اور آخرت کے سارے کام درست ہو جاتے ہیں اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ مجھ پر تیرا غصہ ہو یا تو مجھ سے ناراض ہو۔۔۔ تیری ناراضگی کا اس وقت تک دُور کرنا ضروری ہے جب تک تو راضی نہ ہو جائے۔ تیرے سوا نہ کوئی طاقت ہے اور نہ قدرت"

(سیرت ابن ہشام)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اِن الفاظ کا نکلنا تھا کہ

غیرتِ الٰہی کو جوش آگیا، جبریل امین تشریف لائے، سلام عرض کر کے بولے ۔

اے نبی ۔! خدا کا سلام قبول فرمایئے، جو کچھ آپ پر گذری اُسے خدا نے دیکھا، یہ میرے ساتھ پہاڑوں کا فرشتہ آیا ہے، آپ اجازت دیجیے، طائف کی ظالم آبادی ان دونوں پہاڑوں کے درمیان اس طرح پس جائے گی جس طرح چکی کے دو پاٹوں کے درمیان دانہ پس جاتا ہے

رحمت والے آقا نے جبریل کی یہ پیشکش سُنکر ارشاد فرمایا ۔

جبریل ـــــ! اگر خدا تعالیٰ ان لوگوں کو ہلاک کرنے پر قادر ہے تو وہ ان لوگوں کو ہدایت دینے کی بھی قدرت رکھتا ہے، یہ لوگ بے سمجھ ہیں ـــ اگر یہ لوگ ایمان نہ لائیں تو میں اُمید کرتا ہوں کہ ان کی اولاد کو ـــــــ ایمان کی توفیق نصیب ہوگی ۔

حضرتِ جبریلِ امین علیہ السلام نے ابراہیم خلیل اللہ کی رحمت بھی دیکھی تھی اور حضرتِ مسیح بن مریم علیہ السلام کی شفقت و محبت بھی مگر آج اُن کے سامنے رحمۃٌ للعالمین کی رحمت اور آپ کا عزم محکم ہے ۔

، کیا حضرت جبریلؑ نے اس جواب پر عش عش نہ کی ہوگی ۔

سر ولیم میور تاریخ اسلام کے اس واقعہ پر پہنچکر بے چین اُٹھتا ہے اور حضور رحمتِ عالم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتا ہے ۔

”محمدؐ کے اعتقاد کی مضبوطی اور اُن کا اپنے موقف پر بھروسہ

انھیں اِس مخالف بستی میں لے گیا اور آپ نے تبلیغ اِسلام کا فرض ادا کیا۔

یہ ہے اولوالعزم داعی کی حیثیت سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ پاک جس کی ایک ایک ادا اُمت کے لئے مشعلِ ہدایت ہے۔

حضورؐ ایک "بے گناہ قیدی" کی حیثیت سے

قریش نے دیکھا کہ سختیوں کے باوجود ـــــ اِسلام کی روشنی بڑھتی اور پھیلتی جا رہی ہے، جو عرب کے سُورما باپ دادا کے دین کی حمایت میں "محمدؐ" کو قتل کرنے نکلے وہ خود اس پر قربان ہو کر رہ گئے، ـــ یہ عُمر بن خطاب تھے۔ مکّہ کا کمزور طبقہ اِسلام کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہے، عرب کے تپتے ہوئے ریت پر، جھلستے ہوئے گرم پتھروں پر اور دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جا رہا ہے مگر نہ بلال محمدؐ کا دامن چھوڑ رہے ہیں نہ عمّار، نہ خبّاب۔

اِس ناکامی سے جھنجھلا کر یہ تجویز پاس کی کہ رسولِ پاک اور آپ کے خاندان کا مکمل سماجی بائیکاٹ کر کے اِن سب کو ایک گھاٹی میں قید کر دیا جائے۔

تجویز پاس ہو گئی، ایک معاہدہ ترتیب دیا گیا ـــ کہ کوئی شخص نہ تو بنی ہاشم میں شادی بیاہ کرے اور نہ اُن کی موت و غمی میں شرکت کرے، نہ اُن کے ہاتھ سامان فروخت کرے، نہ اُن کے پاس باہر سے کھانے پینے کا سامان جانے دے جب تک کہ بنی ہاشم محمدؐ سے بیزار ہو کر اُسے قتل کرنے کے لئے

ہمارے سپرد کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔

یہ معاہدہ ذمہ دار لوگوں کے دستخطوں کے بعد کعبہ میں لٹکا دیا گیا۔ خاندان بنی ہاشم کے بزرگ جناب ابوطالب تمام ہاشمی خاندان کے افراد کو لے کر اپنی موروثی گھاٹی "شعب ابوطالب" میں چلے گئے۔

نظر بندی اور اسیری کی یہ مدت تین سال تک رہی، اس زمانے میں حضور سرورِ عالم نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بڑی تکلیفیں اٹھائیں، جنگل کی جڑی بوٹیاں کھا کھا کر پیٹ بھرا۔

ایک دفعہ سعد بن ابی وقاص رضؓ کو سوکھے چمڑے کا ایک ٹکڑا مل گیا۔ سعدؓ نے اس ٹکڑے کو پانی میں دھویا، آگ پر بھونا اور پانی ملا کر کھا لیا اور نفس کو مخاطب کر کے کہا۔۔ "کھا تو لیا اور کیا چاہتا ہے۔؟

بنی ہاشم کے ننھے ننھے بچے جب بھوک سے بلک بلک کر روتے اور اُنکی آہ وزاری کی آواز درہ سے باہر آتی تو قریش کے سنگدل سردار بچوں کے تڑپنے کی آوازیں سُنکر خوش ہوتے، اگر کسی شخص کو ترس آجاتا اور وہ کھانے پینے کا سامان اندر بھیجتا تو سامان کر چھیننے کی کوشش کی جاتی، سنگدلی کی حد ہے

تین سال ان سخت تکلیفوں کے ساتھ گزر جاتے ہیں، قدرتِ الٰہی کو جوش آتا ہے، چند سرداروں کے دِل میں انسانی غیرت اُبھرتی ہے، ہشام عامری عبدالمطلب کا نواسہ زہیر سے کہتا ہے

زہیر۔! یہ کیا غضب ہو رہا ہے، تم عیش کی زندگی بسر کر رہے ہو اور تمہارے ماموں دانے دانے کو ترس رہے ہیں۔

یہ سُنکر زہیر شرم و ندامت میں ڈوب جاتا ہے، کچھ اور غیرت مند بھی ساتھ ہو جاتے ہیں، یہ سیدھا حرم میں آتا ہے اور ابو جہل کو للکارتا ہے اے مکّہ والو۔! ظلم و ستم کی حد ہو گئی ہے، محمدؐ اور اُس کے ساتھی بھُوکے مر رہے ہیں اور ہم داد عیش دے رہے ہیں، خدا کی قسم ۔۔! جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا میں باز نہ آؤں گا۔

ابو جہل برابر سے بولتا ہے ۔۔ ہرگز نہیں ۔۔ اِس عہد نامہ کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا، گفتگو تیز و تند ہو جاتی ہے مگر مُطعِم آگے بڑھتا ہے معاہدہ چاک کر دیتا ہے، سب دیکھتے کے دیکھتے رہجاتے ہیں۔

بنی ہاشم قید سے رہائی پاجاتے ہیں، یہ واقعہ سنلہ نبوی کا ہے۔

حضورؐ عوامی رہنما کی حیثیت سے

غربت کی زندگی

یہ دَور جمہوری اور عوامی کہلاتا ہے اِس دَور میں عوام میں آنے جانے والے اور عوام کی ہمدردی کا نعرہ لگانے والے لیڈر کو "عوامی رہنما" کہتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کوٹھیوں اور فلک نما بنگلوں میں رہ کر جھونپڑیوں میں رہنے والوں کے دُکھ درد کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔؟ شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے عادی انسان غربت و فاقہ اور افلاس و تنگدستی میں گھرے ہوئے اِنسانوں کی مشکلات کا اِحساس کر سکتے ہیں۔؟ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو محض عوام میں آنے جانے سے کسی رہنما کو

"عوامی رہنما" کا درجہ نہیں مل سکتا۔ آیئے۔! ہم بتائیں کہ "عوامی رہنما" عوام کا حقیقی رہنما اور عوام کا حقیقی محسن کون تھا اور اس نے غریب عوام کی ہمدردی کا حق کس طرح ادا کیا۔

آج سے چودہ سو برس پہلے دُنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح عرب میں بھی اونچ نیچ تھی، کوئی عزّت والا تھا اور کوئی حقیر، پیسہ اور اولاد عزّت کی بنیاد تھی، غریبی ہزاروں ذلّتوں کی ایک ذلّت تھی۔ اِس ظالمانہ نسلی چھوت چھات نے اِنسانیت کی مٹی پلید کر رکھی تھی، اس سے خدا کی رحمت جوش میں آئی اُس نے دنیا میں ایک رسول بھیجا، جس کو حکم دیا ــــ اعلان کرو۔ خدا کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور انسان اِنسان سب برابر ہیں، رسولِ پاک نے اعلان کیا اور خدا کی کبریائی اور انسان کی عظمت قائم کرنے کے لئے آپ نے باقاعدہ ایک عوامی تحریک شروع کی۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم عوامی تحریک کے عَلَم بردار ہیں، مکّہ کے رئیس خاندان کے چشم و چراغ ہیں، اُن سرداروں کی اولاد ہیں جو دوسروں کو ذلیل سمجھتے تھے، خاندانی ماحول کا تقاضا تھا کہ محمد بن عبد اللہ میں بھی غرور رہتا، نسلی گھمنڈ ہوتا مگر آپ کا مشن دُنیا کے پس ماندہ طبقوں کو اُبھارنا ہے اِس لئے آپ سردار ہوتے ہوئے بھی غریبوں کی طرح رہتے ہیں، امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے گریز کرتے ہیں تاکہ مظلوم طبقے کے دل سے احساس کمتری دُور ہو۔ رسول پاک کو اپنی معاشرت میں دیکھ کر اُن کے دلوں میں خود اعتمادی پیدا ہو، خود غریبوں کی طرح رہیں تاکہ غریبوں کی مشکلات کا احساس رہے۔

یہ عرب کے روحانی شہنشاہ ہیں، اِشارہ کردیں تو دنیا کی دولت کا اُن کے قدموں میں ڈھیر لگ جائے، لوگ اُن کے سامنے غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں مگر اُن کے رہنے کا حُجرہ چھ سات ہاتھ سے زیادہ لمبا چوڑا نہیں، اِس کی دیواریں کچی مٹی کی ہیں جس پر کھجور کی پتیوں اور ٹہنیوں کا چھپر پڑا ہوا ہے اِس چھپر کے اوپر ایک کمبل بچھا ہوا ہے تاکہ بارش کے پانی سے بچاؤ رہے چھت کی اونچائی اتنی ہے کہ آدمی کھڑا ہوتا ہے تو اُسے چھُو لیتا ہے، دروازے پر ایک پٹ کا کواڑ ہے جس کے آگے بھی پردہ کے لئے ایک کمبل ڈال رکھا ہے۔

اِس گھر کا کُل سامان بھی دیکھ لو۔! سرورِ دین صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں صرف ایک چارپائی ہے، ۔ ایک بستر ۔ ایک تکیہ جس میں روئی کی بجائے کھجور کی چھال بھری ہوئی ہے، ۔ آٹا اور کھجوریں رکھنے کے لئے دو مٹکے، پانی کا ایک برتن، ۔ پانی پینے کا ایک پیالہ ۔ گھر میں روشنی کی یہ حالت ہے کہ چالیس چالیس راتیں گزر جاتی ہیں گھر میں چراغ نہیں جلتا۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی غربت اِختیاری تھی، یعنی آپ نے اپنے لئے اور اپنے ساتھیوں کے لئے غریب زندگی پسند فرمائی تاکہ پیسہ بچا کر اس پیسے سے جماعت کے غریب افراد کی امداد کی جائے اور لوگ باہمی امداد سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائیں، ایسی ہوتی ہے جمہوری اور عوامی رہنمائی

حضرت ابو ہُریرہ رضی اللہ عنہ جماعت کے خاص رُکن ہیں، انھوں نے ساری زندگی دین کی خدمت کے لئے وقف کردی ہے، کمانے کھانے کے لئے انھیں وقت بھی نہیں ملتا۔ اِس لئے ان کا وقت بڑی تنگی سے گزر رہا ہے،

خود فرماتے ہیں، ایک روز کئی وقت کا بھوکا تھا، نماز پڑھ کر جو اٹھا تو کمزوری کے مارے گر پڑا، پیٹ کو زمین سے لگا کر اور اُسے دبا کر اوندھا لیٹ گیا، یہ سوچتا رہا کہ شاید مجھے اِس طرح پڑا ہوا دیکھ کر کوئی اُٹھائے اور پوچھے کہ ابو ہریرہ کیا بات ہے۔؟ لیکن ابو بکر رضؓ بھی گزر گئے، عمرؓ بھی گزر گئے اور بھی صحابہ گزر گئے کسی نے میری طرف توجہ نہ کی، آخر میں میرے محبوب، میرے آقا تشریف لائے اور مجھے دیکھ کر بولے۔ ابو ہریرہ کیا بات ہے، کیوں پڑے ہو۔؟ میں اپنے محبوب کی آواز سُنکر کھڑا ہو گیا (جس طرح ایک مشفق باپ کو دیکھ کر پریشان حال بیٹے کی ڈھارس بندھ جاتی ہے) مجھے اطمینان ہوا عرض کیا حضور۔! کئی وقت سے بھوکا ہوں، کمزوری نے نڈھال کر دیا ہے۔

محبت بھری آنکھوں سے تسلّی دے کر محبوب نے فرمایا۔ کوئی بات نہیں، میرے ساتھ چلو۔ میں آپ کے ساتھ دولت خانے پر حاضر ہوا۔ حکم ہوا۔ ابو ہریرہ ازواج مطہرات کے کمروں پر جاؤ، اُن سے میری طرف سے کہو۔ گھر میں جو کچھ موجود ہو دیدو۔ میں خوشی خوشی اٹھا، یہ سوچکر کہ اب میرا کام بن جائے گا، ازواجِ مطہرات کے دروازوں پر گیا آواز دی لیکن (توقع کے خلاف) ہر دروازہ سے آواز آئی۔ ابو ہریرہ۔! برکت ہے (مایوس ہو کر) میں حضور کی خدمت میں واپس آگیا، اور حضور کو ازواجِ مطہرات کا جواب سُنا دیا۔ آپ نے فرمایا۔

ابو ہریرہ! (بھوک سے تم ہی بے تاب نہیں ہو) میں نے بھی تین وقت سے پیٹ بھر کر نہیں کھایا ہے"۔ چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک انصاری خاتون دودھ کا بادیہ (بڑا پیالہ) لے کر سرکار اقدس کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔

(میری خوشی کو بھانپ کر) مسکراتے ہوئے چہرے سے میرے محبوب نے فرمایا۔
لو ابو ہریرہ اٹھو! اصحابِ صُفّہ کو بلا لاؤ۔ میں نے حکم کی تعمیل کی (اُس وقت
اصحابِ صُفّہ کی تعداد (۱۹) کے قریب تھی)۔ آپ نے فرمایا، ابو ہریرہ۔! یہ
دودھ سب کو پلانا شروع کرو۔ میں کھڑا ہو گیا، باری باری پلانا شروع کیا،
جب ایک صاحب پی چکتے تھے تو میں اُچک کر دیکھتا تھا کہ دودھ ختم ہو گیا ہے
یا باقی ہے، دِل میں کہتا تھا، کیا اچھا ہوتا کہ حضور سارا دودھ مجھے پلا دیتے،
(تاکہ میرا پورا پڑجاتا) اسی طرح جب تمام صحابۂ کرام دودھ پی چکے تو حضور نے
مجھ سے فرمایا۔ ابو ہریرہ۔! اب تم سیر ہو کر پی لو۔ میں پینے بیٹھ گیا،
خوب پیا، کئی وقت کا بھوکا تھا، جب پیٹ بھر گیا تو آخر میں حضور نے پیالہ
منھ سے لگایا۔ قسم کھا کر کہتا ہوں پیالے میں دُودھ جتنا پہلے تھا،
اُتنا ہی اب بھی تھا (۲۱) آدمیوں کے پینے کے بعد بھی پیالہ دودھ سے لبریز تھا۔[ا]
غور کیجیۓ! ابو ہریرہ کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ دینِ حق کے لیۓ میں بھوکا
مر رہا ہوں، رسولِ پاک نے ابو ہریرہ کو تمام پاک بیویوں کے گھر پھرا کر یہ جتایا
کہ ابو ہریرہ اگر تم بھوکے ہو تو یہ خیال نہ کرنا کہ تمہارا رسول عیش کر رہا ہے۔
رسول بھی بھوکا ہے اور رسول کے گھر والوں کے ہاں بھی برکت ہے، اس سے
ابو ہریرہ کو تسلی ہو گئی ہو گی اور دین کے لیۓ مصیبتیں جھیلنے کی پہلے سے زیادہ
ہمت پیدا ہو گئی ہو گی۔

[ا] اِس واقعہ کو امام بخاری رح جیسے شرائط رکھنے والے محدث نے بھی روایت کیا ہے

اوپر کہا گیا ہے کہ رسول پاک کی غربت اختیاری تھی کیونکہ آپ کے غلاموں میں حضرتِ عثمان غنی رضی اللہ عنہ جیسے سخی بھی تھے جو اپنے آقا کے اشارہ کو پاکر سائلوں کو غلّہ سے لدے پھندے اونٹ عطا کر دیا کرتے تھے، ایسے فداکار ساتھیوں کی موجودگی میں رسول پاک اور آپ کے گھر والے کبھی اس طرح بھوکے پیاسے نہیں رہ سکتے تھے لیکن امّت کے غنی جب دیکھتے تھے کہ کونین کے سرور کا نعرہ الفقر فخری (غربت کی زندگی پر میں ناز کرتا ہوں) ہے تو وہ بھی مجبور ہو جاتے تھے

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ زہد زندگی کے آخری سانس تک قائم رہا وفات سے پہلے حضورؐ نے حضرتِ عائشہ کے پاس چند دینار رکھوائے تھے۔ جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپ نے حضرتِ عائشہ رضؓ کو بلا کر کہا، ۔۔ عائشہ ۔! وہ دینار کہاں ہیں، انھیں فقراء مہاجرین پر تقسیم کرادو، یہ ہدایت فرماکر آپ پر بیہوشی طاری ہوگئی، حضرت عائشہ فرماتی ہیں، ۔۔ مجھے پریشانی میں آپ کے حکم کا خیال نہ رہا، تھوڑی دیر کے بعد پھر آپ ہوش میں آئے۔ فرمایا۔ عائشہؓ وہ دینار کہاں ہیں ۔۔ میں نے عرض کیا۔ رکھے ہیں۔ فرمایا۔ جاکر لے آؤ ۔۔ میں نے وہ دینار لاکر حاضر خدمت کئے۔ آپ نے وہ دینار ہتھیلی پر رکھے اور فرمایا۔ عائشہ ۔۔! محمد نہیں چاہتا کہ وہ اپنے خدا سے اس حال میں ملے کہ اس کے گھر میں سونا ہو۔ یہ فرماکر حضرتِ علی کو حکم دیا، انھیں تقسیم کراؤ۔

اس میں اُمّت کے لئے یہ پیغام تھا کہ جب عوام بھوک و افلاس میں گرفتار ہوں تو امیروں کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ سونے اور چاندی کو گھر میں گاڑ کر رکھیں

انسان خود تکلیف اُٹھالیتا ہے لیکن اپنی اولاد کی تکلیف کو گوارا نہیں کرتا، سرورِ عالم نے قوم کی ضرورتوں پر یہ عظیم قربانی بھی کی اور اولاد کو تکلیفوں میں ڈال کر اُمّت کی تکلیفوں کا مداوا فرمایا۔

زہرائے بتول کتنی پیاری بیٹی ہیں، باوا کو چین نہیں پڑتا جب تک کہ بیٹی کو عشار کے بعد نہ دیکھ لیں اور دیکھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا نہ کرلیں، ایسی محبوب بیٹی کو ایسے غریب شوہر کے ساتھ بیاہا جس نے استعمال کی زرہ فروخت کر کے مہر کا انتظام کیا، ـــــ مدینہ میں نہ امیر گھرانوں کی کمی ہے نہ امیر زادوں کی لیکن نبی نے ابوطالب کے بیٹے "علی" کو انتخاب فرمایا۔ بیٹی کو خالی گھر رخصت کیا دونوں جہاں کی شاہزادی ضرورت کے چند برتن اور مشقّت اُٹھانے کے لئے ایک چکی اور ایک مشکیزہ جہیز میں لے کر روانہ ہوئیں، غریب باپ کی غریب بیٹی غریب شوہر کے ساتھ غریب گھر میں ہنسی خوشی رہنے لگی، محنت پسند باپ کی محنتی بیٹی گھر کا کام کاج خود کرتیں، چکی خود پیستیں، پانی خود بھر کر لاتیں، جس سے ہاتھوں میں گٹّے پڑجاتے اور جسمِ اقدس پر مشکیزہ کے نشانات، غریب شوہر کو ترس آتا، مگر غریب کلیجہ مسوس کر رہ جاتے، ایک روز پتہ چلا کہ حضور کے پاس غنیمت کے لونڈی غلام آئے ہیں، شوہر نے سیّدہ سے کہا۔

"سیّدہ! حضور آباجان کے پاس جاؤ، اپنی حالت دکھاؤ، مصیبت سُناؤ اور گھر کے کام کاج کے لئے ایک باندی لے آؤ۔"

سیّدہ خوشی خوشی میکے آئیں، آباجان تو نہ ملے، اماں جان سے گزارش کرآئیں، ـــــ رات کو سرورِ عالم گھر آئے۔ اماں جان نے سیّدہ کے آنے کی

کیفیت سنائی، ۔ عورت، عورت کے حالات سے زیادہ متاثر ہوتی ہے، بیٹی کی مشقت بھری زندگانی کا اماں نے کتنا اثر لیا ہوگا اور اُسے دردمند باپ تک کس طرح پہنچایا ہوگا۔ ابا نے بیٹی کی درخواست سُنی، ایسی بیٹی پر ایک باندی کیا ہزار باندیاں قربان کی جاسکتی تھیں، باندیاں کیا اُمت کی ساری مائیں اُن کی غلامی کے طوق کے لئے اپنی گردنیں پیش کر سکتی تھیں، مگر اُمت کو اولاد کی طرح چاہنے والے رسول نے ماں کی زبان سے بیٹی کی فریاد سُنی اور فوراً داماد کے گھر تشریف لائے، بیٹی سے فرمایا۔

سیدہ! میں ابھی اصحاب صُفّہ کی ضروریات سے (جو میری ضروریات اور میری اولاد کی ضروریات سے مقدم ہیں) فارغ نہیں ہوا، سب سے پہلے میں اُن کی ضرورت پوری کروں گا۔[1]

پھر بیٹی کو اللہ کا ذکر تعلیم فرمایا[2] ذاکر باپ کی بیٹی ذکر سے خوش ہوگئی شاکر باپ کی بیٹی نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پریشانی اور مایوسی کیسی۔؟

عوام کی بھلائی چاہنے کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے اس کے لئے

---

[1] حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ ولکنی ابیعھم وانفق اثمانھم علیٰ اصحاب الصُّفّۃ (کنزالعمال)

[2] وہ ذکر یہ ہے، سُبحَانَ اللہ ۳۳ دفعہ وَالحمد للہ ۳۳ دفعہ واللہ اکبر ۳۳ دفعہ اور ایک دفعہ آخر میں یہ لا الٰہ اِلّا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ، لہٗ الملکُ ولہٗ الحمد وھُوَ علیٰ کل شیءٍ قدیر ہ

نہ صرف اپنا آرام جاں قربان کرنا پڑتا ہے بلکہ اپنی اور اپنے تمام گھر والوں کے آرام کی قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔

یہ ہیں "عوامی رہنما" جنھوں نے عوام کو اُبھارنے اور ان کی ترقی کےلئے محض تقریروں سے کام نہیں لیا، بلکہ عوام کی معاشی، سماجی اور اقتصادی حالت کو اُوپر اُٹھانے کے لئے سماجی برابری کا ایک مکمل پروگرام پیش کیا، معاشی انصاف کا ایک مکمل ضابطہ سامنے رکھا، امیروں پر ذمہ داریاں عائد کیں، اپنا اور اپنے گھر والوں کا عیش و آرام قربان کیا، خود بھوکا رہ کر غریب عوام کا پیٹ بھرا، غریب عوام کی ضروریاتِ زندگی کا انتظام کرنا حکومتِ حق کے فرائضِ منصبی میں شامل کیا۔

حضورؐ ایک شریف مہمان کی حیثیت سے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہمان کی حیثیت سے بھی اُمّت کے لئے ایک بہترین اُسوہ چھوڑا ہے، آپ ایک طرف اپنے میزبان کے ساتھ بے تکلف دوست کا رویہ اختیار کرتے تھے تو دوسری طرف اپنے میزبان کے جذبات کا بھی پورا پورا لحاظ فرماتے تھے۔

ایک صحابی نے حضور کی دعوت کی تو آپؐ نے بے تکلفی سے فرمایا، میری بیوی عائشہ بھی ساتھ میں ہوگی۔ اُس کے ہاں انتظام صرف ایک آدمی کا تھا، اُس نے کہا۔ میں مشورہ کرلوں، حدیث میں آتا ہے کہ وہ شخص تین دفعہ حاضر ہوا اور

آپ نے ہر دفعہ حضرتِ عائشہ کو ساتھ لے چلنے پر اصرار فرمایا اور بالآخر اُس نے منظور کر لیا۔

آپ کے اصرار کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عائشہ بھی آپ کے ساتھ کئی دن سے فاقہ میں دن گزار رہی تھیں۔ آپ نے اُنھیں چھوڑ کر جانا گوارا نہ فرمایا۔ یہ حضور کی بے تکلفی تھی۔

آپ میزبان کے حالات پر بھی نظر رکھتے تھے، اس پر زیادہ بوجھ نہ بنتے تھے، جو حاضر کیا جاتا بے تکلف نوش فرما لیتے، ایک انصاری خاتون کے ہاں جمعہ کی نماز کے بعد ہمیشہ تشریف لے جایا کرتے تھے، حضرتِ انس رضؓ ساتھ ہوتے تھے وہ خاتون چقندروں کا سالن پیش کیا کرتی تھیں اور ہر جمعہ کو آپ کا اِنتظار کرتی تھیں۔

آپ فرمایا کرتے تھے، کسی کا ہدیہ واپس نہ کیا کرو۔ کیونکہ اِس سے اُس کا دِل ٹوٹ جائے گا، آپ دعوت قبول کرنے کی بھی تاکید فرماتے تھے، آپ کا ارشاد ہے۔ تہادوا تحابوا۔ یعنی آپس میں ہدیئے دیا لیا کرو، محبت زیادہ ہو گی۔

حضورؐ فیاض میزبان کی حیثیت سے

مہمان نوازی عربوں کی قومی خصوصیات میں داخل ہے مگر عرب و عجم کے آقا حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مہمان نوازی کی بہت ہی شاندار مثال قائم فرماتے ہیں

اس وقت کی بات ہے جب مدینہ کے یہودی اسلامی تحریک کو ناکام کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے، حضورؐ کو قتل کرنے کی خفیہ سازشیں کر رہے تھے، کھانے میں زہر دے کر ہلاک کرنے کی ناپاک کوششیں ہو رہی تھیں، ان حالات میں حضور کے پاس ایک یہودی سردار آیا، پاک دل اور بے خطر سچے رسول نے آنے والے مہمان کی تواضع میں زمین پر اپنی چادر بچھا دی، صحابہ کی محبت نے اپنے محبوب کے اس شریفانہ فعل پر توہین محسوس کی، کہاں ہمارے آقا کی عظمت جس کو ہم آنکھوں سے لگائیں، عزت سے سر پر رکھیں اور اس پر ایک دشمنِ خدا کے قدم پڑیں، —؟ دل میں یہ سوچا زبان سے عرض کیا۔ حضور! دشمنِ خدا کی اتنی عزت افزائی —؟ شریف میزبان نے جواب دیا۔ "یہ اپنی قوم کا سردار ہے، اسی عزت کا مستحق ہے۔"

مہمان نواز پیغمبر نے اپنی امت کو ہدایت فرمائی — جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے[۱]۔

ابی سینیا کے بادشاہ نجاشی کے پاس سے ایک ڈیپوٹیشن آیا، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنا مہمان بنایا اور بہ نفسِ نفیس مہمانداری کے فرائض انجام دیئے، صحابۂ کرام نے ہر چند چاہا کہ یہ خدمت وہ انجام دیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِن لوگوں نے میرے دوستوں کی، جب وہ حبشہ کی ہجرت

---

[۱] کتاب الادب، باب اکرام الضیف (بخاری)

کر کے گئے تھے، خدمت کی ہے اِس لیے میں خود اِن کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

ایک واقعہ امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الطہارت" میں نقل کیا، لقیط بن صبرہ کہتے ہیں، میں بنی منتفق کے وفد کے رفیق کی حیثیت سے حضور کی خدمت میں حاضر ہوا، حضور دولت خانہ پر موجود نہیں تھے، حضرت عائشہ تشریف رکھتی تھیں، آپ نے ہم مہمانوں کے لیے کچھ کھانا اور کھجوریں پیش فرمائیں پھر حضرت تشریف لے آئے اور ہم سے پوچھا۔ کچھ کھایا۔؟ ہم نے عرض کیا، جی ہاں، اتنے میں ایک چرواہا بکریوں کا ریوڑ لیے سامنے سے گزرا اس کے ریوڑ میں ایک پٹھیا بھی تھی جو " میں میں" کر رہی تھی، آپ نے اس چرواہے سے فرمایا " راعی۔! یہ کیا ہے، وہ بولا پٹھیا ہے۔

آپ نے فرمایا۔۔۔ اِس بچے کی بجائے ایک بکری ہمارے مہمانوں کے لیے ذبح کر دو، وہ تیار ہو گیا۔

چرواہے نے حضور کے چہرے پر اظہارِ تشکر کا کچھ اثر محسوس کیا، تو فوراً بولا۔۔۔ حضور! میں اِس بکری کو آپ کی وجہ سے ذبح نہیں کر رہا، بلکہ ہمارا طریقہ یہ ہے۔ کہ جب سو بکریوں پر کوئی بکری زیادہ ہو جاتی ہے تو بچے کے ہونے پر ہم ایک بکری ذبح کر دیتے ہیں تاکہ ہمارے جانور سَو سے زیادہ نہ ہوں صرف سَو رہیں۔

حضور کی مہمان نوازی کا ایک عجیب واقعہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ابواب الاطعمہ میں حضرتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں۔

حضور کی خدمت میں ایک غیر مسلم حاضر ہوا، آپ نے صحابہ کو حکم دیا، مہمان کے لیئے ایک بکری کا دودھ لاؤ۔ دودھ لاگیا، مہمان سارا دُودھ پی گیا۔ حضور نے پھر فرمایا ایک بکری کا دُودھ لاؤ، صحابہ نے پھر حکم کی تعمیل کی اور ایک دوسری بکری دوہ کر لائی گئی، مہمان وہ دودھ بھی پی گیا، حضور نے تیسری بکری کو دوہنے کا حکم دیا۔ اس طرح وہ مہمان سات بکریوں کا دودھ پی گیا، مہمان پی تارہا حضور پلاتے رہے، سات بکریوں کے دودھ سے سیر ہو کر وہ چلا گیا، مہمان صبح کو پھر حاضر خدمت ہوا اور حضور کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہو گیا۔

حضور نے اِس مہمان کی تواضع کے لئے پھر بکری کا دُودھ لانے کا حکم دیا، صحابہ ایک بکری کا دودھ لائے، مہمان دُودھ پی گیا، آپ نے فرمایا۔ اور لاؤ۔ دوسری بکری کا دودھ اور لایا گیا۔ یہ دُودھ اس سے پیا نہ گیا اور کچھ بچا دیا اِس پر حضور نے فرمایا۔

المومن یشرب فی معیٍ واحد والکافر یشرب فی سبعۃ امعاءٍ

یعنی مومن ایک آنت میں پیتا ہے اور کافر سات آنتوں میں۔

سات آنتوں میں پینا" اِس امر کی طرف اشارہ ہے کہ کافر میں حرص و طمع زیادہ ہوتی ہے۔

حضورؐ با اصول رہنما کی حیثیت سے

با اصول رہنما سے مراد وہ رہنما ہے جو اپنے اصولوں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہو، ہر چیز کا نقصان گوارا کر لیتا ہو مگر اپنے اصولوں کی توہین برداشت نہ کرتا ہو، با اصول رہنما مفاد پرست لیڈر کی بالکل ضد ہوتا ہے مفاد پرست لیڈر ہر موقعہ پر مفاد کو سامنے رکھتا ہے، اس کے نزدیک اصول صرف ایک نمائشی چیز ہوتی ہے، وہ جو قانون خود بناتا ہے اُسے عملی زندگی میں خود توڑ سکتا ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس حیثیت سے بھی دنیا کے تمام رہنماؤں میں حیرت انگیز حد تک ممتاز نظر آتے ہیں۔ چند واقعات ملاحظہ فرمائیے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم شہریوں کو مذہبی آزادی کا حق عطا فرمایا، ایسا حق نہیں جو صرف قانون کی کتابوں میں ہو بلکہ ایسا حق جو عملی زندگی میں زندہ حقیقت کی طرح چلتا پھرتا نظر آتا ہو، مذہبی آزادی کے اس علم بردار نے جب کبھی ذمّیوں کے اس بنیادی حق کو پامال ہوتے دیکھا تو ہر مصلحت سے بے نیاز ہو کر اس کی حفاظت کی۔

مدینہ طیّبہ میں یہودی ایک مذہبی اقلیّت تھے، ایک روز مسلم اکثریت کے ایک سر برآوردہ بزرگ حضرتِ ابوبکرؓ ایک یہودی دوکاندار سے سودا خرید رہے تھے، اس یہودی نے مول تول کرتے ہوئے قسم کھائی — قسم ہے اس ذات کی جس نے حضرتِ موسیٰ کو تمام عالم پر فضیلت دی ہے — یہ قسم۔

اُس یہودی کے عقیدہ کے عقیدہ کے مطابق تھی۔[۱]

چونکہ مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق سب رسولوں سے افضل سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس لئے حضرتِ ابوبکر رضؓ اِس طرح کی قسم سُنکر بگڑ گئے اور اُس یہودی دوکاندار کے ایک طمانچہ مار دیا، یہودی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ کو عدل و انصاف کی عدالت سمجھتا تھا۔ اور حضور کو بے لوث عادل جج! اس سبب سے وہ سیدھا حضور کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور آپ سے صدیقِ اکبر کے طمانچہ کی فریاد رسی کی۔[۱]

ایک مظلوم انسان کی فریاد سُنکر رحمتِ عالم بے تاب ہو گئے۔ بلال کو حکم دیا کہ ابوبکر کو بُلا لاؤ۔ ابوبکر حاضر ہوئے، دیکھا کہ آقا کے چہرہ پر غیض و غضب برس رہا ہے اور سامنے فریادی یہودی کھڑا ہے۔

سرورِ عالم نے ابوبکر صدیق کو دیکھتے ہی سوال کیا۔ ابوبکر! یہ یہودی کیا فریاد کر رہا ہے؟ تم نے اِس کے طمانچہ کیوں مارا۔؟

حضرتِ ابوبکر نے سارا واقعہ سنایا۔ واقعہ سُنکر ارشاد فرمایا۔ یہودی نے اِسلام کا بخشا ہوا حق استعمال کیا۔ تم کون تھے، اس حق سے

---

[۱] فتح الباری کتاب الانبیار جلد ۶ ص ۳۴۴ سے یہ تفصیل لی گئی ہے۔ اِس واقعہ سے حضور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جزوی فضیلت ثابت ہوتی ہے نہ مطلق فضیلت یہودی نے جن الفاظ میں فریاد کی وہ یہ ہیں۔ فقال الیہودی یا ابا القاسم ان لی ذمۃً وعھداً فما بال فلانٍ لطم وجھی۔

اُسے رد کرنے والے ـــــ پھر فرمایا۔ تمہیں معلوم بھی ہے موسیٰ علیہ السلام کی عظمت کا حال ــ؟ قیامت کے دن دوسرے صُور کی آواز پر سب سے پہلے میں ہوش میں آؤں گا۔ لیکن ہوش میں آکر کیا دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام خدا کے عرش کا پایا پکڑے کھڑے ہیں، میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ پہلے صور پر بے ہوش ہی نہیں ہوئے تھے، کیونکہ دنیا میں طُور پر بے ہوش ہو چکے تھے یا بے ہوش تو ہوئے مگر سب سے پہلے ہوش میں آگئے۔

ایک یہودی خونچے والے کے مقابلے میں سب مسلمانوں کے اتنے بڑے لیڈر پر اس قدر ناراضگی ــ؟ یہ خیال نہ فرمایا۔ کہیں مسلمان بگڑ نہ جائیں اور یہ نہ کہیں کہ ہم تو پیغمبر کی عزت کے لئے جان دیتے پھریں، ایک ایک سے لڑتے پھریں اور پیغمبر ایک خونچے والے کے مقابلے میں ہمیں شرمندہ کریں، مجرم قرار دیں ـــــ ایک با اصول رہنما اس قسم کے خطروں سے بے نیاز ہو کر دنیا میں انسانی حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔

غیر مسلم رعایا کے حقوق ۔۔۔!

عدل و انصاف کے اِس علم بردار رسول نے اپنے عملی برتاؤ سے غیر مسلم شہریوں کے ساتھ برابری اور شرافت کا جو سلوک کیا اوپر اس کی ایک دو مثالیں پیش کی گئیں۔

اِس سلسلہ میں آپ نے اپنے ماننے والوں کو جو عام ہدایات فرمائیں وہ بھی ملاحظہ ہوں۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا۔

الا من ظلم معاھداً او انتقصہ او کلفہ فوق طاقتہ او اخذ منہ شیئاً بغیر طیب نفسہ فانا حجیجہ یوم القیمۃ۔

(ابوداؤد)

کسی غیر مسلم رعیت پر جس نے ظلم کیا یا اُن کی توہین کی یا اُس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف دی یا اُس سے کچھ بغیر اس کی خوشی کے لے لیا میں قیامت کے دن اس کی طرف سے جھگڑا کروں گا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے

من قتل معاھداً لم یرح رائحۃ الجنۃ وان ریحھا توجد من مسیرۃ اربعین خریفاً۔

(بخاری شریف)

جس کسی نے غیر مسلم رعیت کو قتل کر دیا تو اس کو جنت کی خوشبو بھی نہ ملے گی حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس برس کی دوری تک جاتی ہے، یعنی جنت کے قریب بھی نہ ہو سکے گا

ایک موقعہ پر فرماتے ہیں۔

الراحمون یرحمھم الرحمن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء (ترمذی وابوداؤد)

جو لوگ رحم کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر رحمت کرتا ہے، تم زمین کے بسنے والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

یہ ہیں عدل و انصاف اور انسانی ہمدردی کے اعلیٰ اصول جو رسول پاک صلعم نے دُنیا کے سامنے ایک اٹل قانون بنا کر پیش کئے اور آپ نے خود بھی اور آپ کے جانشین صحابہ کرام رضٰ نے بھی ان اصولوں پر حکمرانی کا ایک ایسا عمدہ اور اعلیٰ نظام بنایا جسے تاریخ نے اپنے سینہ میں آج تک محفوظ کر رکھا ہے۔

حضرت حمزہ رض کا اسلام ــــ!

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ مشہور ہے، حضرت حمزہ رض نے سُنا کہ ابو جہل نے بھتیجہ کو گالیاں دی ہیں ہاشمی خون جوش میں آگیا قسم کھائی، جب تک ابوجہل سے انتقام نہ لوں گا ایک دانہ منھ میں نہیں ڈالونگا سیدھے بھتیجے کے پاس آئے اور اپنے ارادے سے مطلع کیا، بھتیجے نے سُنا۔ کوئی بے اصول لیڈر ہوتا تو موقعہ کو غنیمت سمجھتا، چچا کو دشمن کے خلاف اور بھڑکا دیتا لیکن آپ ایک با اصول رہنما تھے، اپنی جان سے زیادہ اپنے پیغام اور اصول کو عزیز رکھتے تھے، چچا سے بولے ـــــ "چچا جان ـــ! اگر بھتیجے کو خوش کرنا چاہتے ہو تو اُس کا پیغام قبول کر لو، حضرت حمزہ رض کے دل پر حضور کے اس جواب کا بڑا گہرا اثر پڑا اور فوراً اسلام قبول کر لیا۔

لوگ کہتے ہیں حاکم کی تعریف میں ـــ "وہ حاکم بڑا مہربان ہے" اور اس سے اُن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ حاکم قصور وار کو بھی چھوڑ دیتا ہے، چور کو چوری کرتے ہوئے پکڑتا ہے اور سزا نہیں دیتا۔ یہ ہے لوگوں کے نزدیک اچھے حاکم کا مطلب ـــــ لیکن کیا سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی معنیٰ میں مہربان ہیں معاذ اللہ ـــ اس قسم کی مہربانی کہ چور اور شریف کو ایک نظر سے دیکھنے پر مجبور کرے مہربانی کہلانے کی مستحق نہیں ہے، اسے بزدلی اور بے اصولاپن کہنا چاہئے سرکارِ دو عالم ایک با اصول رہنما تھے اور اپنے اصولوں کے مطابق آپ جس طرح ایک شریف آدمی کو عزت کے قابل سمجھتے تھے اسی طرح ایک چور کو سزا کے لائق قرار دیتے تھے، نیکیوں سے پیار کرتے تھے اور برائیوں سے نفرت۔

قرآنِ کریم کو دیکھو۔! جہاں وہ حضور کی رحمت اور شفاعت کا ذکر کرتا ہے وہاں یہ بھی کہتا ہے کہ رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن مجرموں کی شکایت بھی کریں گے

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ — اور رسول نے کہا ــــــــ
قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ — اے میرے رب، بے شک میری قوم نے
مَهْجُوْرًا ۝ (سورۂ فرقان) — قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔

معلوم ہوا کہ ایک با اصول رہنما کو ضرورت کے وقت ناراض بھی ہونا چاہئے۔ اور وہ ناراضگی اور غصّہ اصولوں کی حفاظت کی خاطر ہوتا ہے، ذاتی عناد کی بنا پر نہیں ہوتا۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں غزوان شامی سے ایک حدیث نقل کی ہے وہ کہتے ہیں، میں حج کے لئے جا رہا تھا، راستہ میں میں نے تبوک میں قیام کیا، دوران قیام میں میرے سامنے ایک اپاہج آدمی آیا جو چلنے پھرنے سے معذور تھا ــــ میں نے اُس کی معذوری کی وجہ پوچھی، وہ بولا میں تمھیں ایک واقعہ سناتا ہوں لیکن جب تک یہ بات تمہارے علم میں رہے کہ میں زندہ ہوں، تم یہ واقعہ کسی کو نہ سنانا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضور غزوۂ تبوک کے سلسلہ میں اس مقام پر تشریف لائے۔ اور کھجور کے ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر فرمایا۔ یہ درخت ہمارا سُترہ ہے پھر اِس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا فرمانے لگے، میں ایک گدھے پر سوار ہو کر حضور کے سامنے سے دوڑتا ہوا گذر گیا۔ حضور نے میری اِس حرکت پر فرمایا۔

قطع صلوٰتنا قطع اللّٰہ اثرہ — اس نے ہماری نماز خراب کی، اللہ تعالیٰ اس کی رفتار کے نشان کو مٹادے

علماء نے اثر مشبہ سے حضور کے جملہ کی تفسیر کی ہے، میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کے چلنے کا اثر باقی نہ رہے اور دوسرے لوگ اس کی پیروی نہ کریں۔

چنانچہ حضور کے اس تنبیہی جملہ کو خدا تعالیٰ نے اس صورت میں قبول فرمایا کہ وہ اپاہج ہوگیا، اس کے پیر شل ہو گئے۔

جس ذات اقدس کی زبان پر بڑے سے بڑے ظالم کے لئے بددعا نہ آتی ہو اس گرامی قدر نبی نے آج نماز کے آگے سے گذرنے والے کے لئے ان لفظوں میں ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ وجہ اس کی ظاہر ہے، حضور نے لوگوں کو یہ بتایا کہ اللہ کے نبی نماز کو اس قدر محبوب رکھتے ہیں، نماز کی حفاظت آپ کے نزدیک اتنی ضروری ہے کہ نماز میں خلل ڈالنے والے پر حضور اس قدر ناراض ہوئے اور اس روحانی تکلیف پر یہ جملہ ادا فرمایا۔ (بذل المجہود جلد ا ص ۲۷۳)

اس واقعہ سے ناظرین کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے حق میں ایک معمولی سی بات پر بددعا فرمائی جس ذات اقدس کے اخلاقِ کریمانہ نے کبھی تکلیف دینے والوں کا برا نہ چاہا ہو اُس رحمت صفت ذات کے متعلق اس واقعہ میں یہ بیان کیا جارہا ہے

اس کا جواب ہمیں رحمتِ عالم کے ایک ارشاد گرامی میں مل جاتا ہے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الدعوات میں حضرتِ ابوہریرہ رضؓ سے

ایک حدیث نقل کی ہے، فرماتے ہیں ــــ میں نے حضور کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا ہے

اَللّٰھُمَّ فَاَیُّمَا مُؤْمِنٍ سَبَبْتُہٗ فَاجْعَلْ ذَالِکَ قُرْبَۃً اِلَیْکَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔

خداوندا ــــ! جس مسلمان پر میں ناراض ہُوا ہوں، اس مسلمان کے حق میں میری یہ ناراضگی قیامت کے دن اپنی بارگاہ میں قرب و نزدیکی کا سبب بنا دیجیو۔

فتح الباری پارہ ۲۶ صفحہ ۹

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضؓ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے یہ دُعا اس وقت فرمائی جب دو شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کسی معاملہ میں آپ سے گفتگو کی اور وہ حضور پر ناراض ہوئے، حضور اُن دونوں کی ناراضگی اور گستاخی پر خفا ہوئے ــــ فاغضباہ فسببھما ولعنھما

جب دونوں چلے گئے تو میں نے آپ سے عرض کیا کہ حضور آپ ان لوگوں پر اس قدر کیوں بگڑے اور کیوں انھیں سخت و سُست کہا ــــ؟ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا۔

اِنما انا بشر ارضی کما یرضی البشر واغضب کما یغضب البشر فایما احد دعوت علیہ من امتی بدعوۃ لیس لھا باھل ان یجعلھا اللہ طھوراً وزکاۃ وقربۃ یقربہ بھا منہ یوم القیامۃ

میں انسان ہوں انسانوں کی طرح کبھی راضی ہوتا ہوں اور کبھی ناراض پس میں اپنے جس امتی کے حق میں بد دُعا کردوں اور اس کا مستحق نہ ہو تو اس بد دُعا کو اس کے لئے گناہوں سے پاک ہونے اور قیامت میں اپنے تقرب کا ذریعہ بنا دیجیو۔

اِس روایت میں بعض جملے حضرتِ انس رضؓ کی روایت کے اور باقی حضرتِ عائشہ رضؓ کی روایت کے ہیں۔

علّامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اِس حدیث پر مفصل گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضور کی ناراضگی خدا کے لئے ہوتی تھی، خدا کے دِین کے لئے ہوتی تھی تاکہ لوگوں میں خدا کی نافرمانی کا رجحان نہ بڑھے، آپ مجرم پر ناراض ہوتے اور اِس سے دوسروں کو بھی عبرت ہوتی (فتح۔ حوالۂ مذکور)

اس کا ایک لطیف جواب حضرت مولٰنا انور شاہ صاحب رح سے نقل کیا جاتا ہے۔

بعض اوقات انبیاء علیہم السّلام اور اہل اللہ کی جناب میں گستاخی کی جاتی ہے، اس پر غیرتِ الٰہی کو جوش آتا ہے۔ یہ مقربین خداوندی مشیت کے غضب آلود تیور دیکھ کر لرز جاتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ گستاخی کرنے والے کو خدا کے غضب سے بچایا جائے پھر اُس کے لئے وہ طریقہ اِختیار کرتے ہیں کہ اُس شخص سے خود اِنتقام لے لیتے ہیں۔

اِس انتقام اور بدلے سے خدا کا غضب ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور وہ گستاخ معمولی تکلیف میں گرفتار ہو کر بڑی تکلیف سے بچ جاتا ہے، اگر خدا کے پیارے بندے اِس موقعہ پر اپنی عام عادت کے مطابق صبر و تحمل سے کام لیں تو وہ گستاخ کسی بڑی تکلیف میں مبتلا ہو جائیں، اِس لئے اِس موقعہ پر رحم و مہربانی کا یہی تقاضا ہے کہ گستاخوں سے بدلہ لیا جائے۔

اِسلامی معاشرہ کی تنظیم

ایک ایسی سوسائٹی جس میں تنظیم ہو۔ قانون کا احترام ہو، فرائض کا احساس ہو، اپنے حقوق سے زیادہ دوسروں کے حقوق کی نگہداشت کا خیال ہو، جرائم سے نفرت ہو، نیکیوں سے محبت ہو اور اس کا ہر فرد ایثار اور خدمت کے جذبہ سے سرشار ہو، صرف پولس اور فوج کی طاقت سے وجود میں نہیں آتی بلکہ وہ اخلاقی تعلیم جس کی بنیاد توحید اور ایمان بالآخرت پر قائم ہو ایسی مہذب سوسائٹی کو تشکیل دیتی ہے۔

اِسلام نے جس مہذب معاشرہ کا نمونہ پیش کیا ہے اس کی تاریخ دنیا کے سامنے موجود ہے۔

غور کیجیے۔! نہ تار ہے نہ ٹیلیفون ہے نہ ریڈیو ہے نہ ریل اور ہوائی جہاز ہے، نہ مدرسے ہیں نہ کالج، نہ اخبارات ہیں نہ رسائل نہ جگہ جگہ پولیس چوکیاں اور فوجی چھاؤنیاں قائم ہیں اور نہ سی آئی ڈی کے محکمے لیکن اس کے باوجود معاشرہ میں اتنا نظم قائم ہے کہ کوئی شخص قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتا ایک دوسرے کے حقوق پر ہاتھ نہیں ڈالتا مذہب کا اختلاف ہے، خیالات میں فرق ہے مگر مجال نہیں کہ کسی کے جذبہ کو ادنیٰ ٹھیس لگ جائے، برائی سر اٹھاتی ہے تو معاشرہ پوری قوت سے اس کی سرکوبی کے لئے دوڑتا ہے، نیکی اور خدمت کا

نیکی اور خدمت کا موقعہ نکلتا ہے تو ہر شخص آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے
قانون کے معاملہ میں نہ رشتہ داری کا پاس ہے، نہ دوستی و محبت کا
لحاظ، ہر شخص محتسب ہے اور ہر چھوٹا بڑا قانون کی حفاظت کا ذمہ دار۔
ذاتی مفاد، ذاتی آرام و آسائش مال و دولت سب کچھ اصول کے
مقابلہ میں، ہیچ ہیں۔

یوں تو پوری اسلامی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے لیکن اس موقعہ
پر اس زرّین تاریخ کا ایک نہایت سبق آموز اور عبرت انگیز واقعہ پیش کیا جارہا ہے،
غزوہ تبوک کی شرکت سے جہاں منافقین کی بڑی جماعت نے پیٹھ
دکھائی وہاں چند مخلص مسلمان بھی بغیر کسی عذر شرعی کے پیچھے رہ گئے، یہ موقع
کفر و اسلام کی کشمکش کا ایک نازک موقعہ تھا اس لئے نفیر عام کے باوجود
جو لوگ پیچھے رہ گئے، ان سے بازپرس کی گئی، ان مخلصین میں کچھ تو ———
(ابولبابہ وغیرہ) جیسے حضرات ایسے تھے جن کی توبہ فوراً قبول کرلی گئی، اور
کچھ ایسے تھے جن کا معاملہ مشکوک ہونے کی وجہ سے ملتوی کردیا گیا۔

وآخرون مرجون لامر اللہ	اور بعضے لوگ ہیں کہ ان کا کام
اما یعذبھم واما یتوب علیھم	ڈھیل میں ہے حکم پر اللہ کے یا وہ ان کو
	عذاب دے اور یا ان کو معاف کرے

یہ تین بزرگ تھے، حضرت کعبؓ بن مالک، ہلالؓ بن امیہ واقفی،
مرارہؓ بن ربیع عامری

ان تینوں صاحبوں میں حضرتِ کعب بن مالک نے اپنا پورا قصہ

اپنے صاحبزادے عبد اللہ سے بیان کیا ہے، کعب بڑھاپے میں نابینا ہو گئے تھے اور عبد اللہ اُن کا ہاتھ پکڑ کر چلایا کرتے تھے، کعب کہتے ہیں۔

میں غزوۂ تبوک کے سوا کسی غزوہ میں پیچھے نہیں رہا اگرچہ غزوۂ بدر میں بھی شریک ہونے کا موقعہ نہیں ملا لیکن چونکہ اس میں شریک نہ ہونے والوں پر خدا کی طرف سے کسی قسم کی سرزنش نہیں ہوئی کیونکہ سرورِ عالم قافلہ کے ارادے سے نکلے تھے وہاں خدا کی مرضی یہ ہوئی کہ قریش سے مقابلہ ہو، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ مقابلہ کی نوبت آجائے گی اس لئے میں شریک نہیں ہو سکا۔ ہاں مجھے فخر ہے کہ لیلۂ عقبہ میں سرورِ عالم کے ساتھ تھا۔ اور اس موقعہ پر میں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کی تھی اگرچہ میرے خیال میں لیلۂ عقبہ کی شرکت بدر سے افضل ہے لیکن عام مسلمانوں میں بدر کی شہرت زیادہ ہے رہا غزوۂ تبوک کی عدم شرکت کا معاملہ تو وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔

غزوۂ تبوک کے موقعہ پر خدا تعالیٰ کی مہربانی سے میں بہت خوشحال تھا مجھے وہ تمام سہولتیں میسّر تھیں جو اس سے پہلے میسر نہ ہوئی تھیں، میرے پاس دو اونٹنیاں تھیں — حضور سرورِ عالم کی عادت یہ تھی، کہ آپ غزوہ میں جاتے وقت "توریہ" فرماتے تھے، یعنی لوگوں کو مصلحتاً صاف صاف بات نہ بتایا کرتے تھے لیکن اس موقعہ پر آپ نے مسلمانوں کو اپنے پروگرام سے مطلع کر دیا تھا تاکہ موسم کی شدت، دُور دراز کے سفر اور

دشمن کی کثرتِ تعداد کو سامنے رکھ کر مسلمان اچھی طرح تیاری کرلیں۔

اِس غزوہ میں چلنے والے مسلمانوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ رجسٹر ناکافی ہوگیا تھا۔ اِس لئے غزوہ میں شریک نہ ہونے والوں کا پتہ آپ کو نہیں چل سکتا تھا سوائے اِس کے کہ خدا تعالیٰ آپ کو خبر دے۔

اِس موقعہ پر ایک طرف تو گرمی کی شدّت تھی اور دوسری طرف پھل تیار کھڑے تھے (جن پر پورے سال کی معاش کا دارومدار تھا) لیکن اِس کے باوجود عام مسلمان اور سرورِ عالم تیاریوں میں مصروف تھے، میری حالت یہ تھی کہ میں سامان خریدنے کے لئے گھر سے نکلتا اور اِدھر اُدھر پھر کر شام ہوجاتی اور میں خالی ہاتھ گھر واپس آجاتا، دل میں کہتا کیا بات ہے، پیسے ہاتھ میں ہیں کل تیاری کرلوں گا۔ اِس طرح آج کل کرتے کرتے کوچ کا دن قریب آگیا اور لشکرِ اسلام روانہ ہوگیا، اِس پر بھی میں یہی کہتا رہا کہ کوئی فکر کی بات نہیں، سامان کرکے ایک دو دن میں لشکر کو جا پکڑوں گا

اِس لیت ولعل کا نتیجہ یہ ہوا کہ لشکر بہت دُور نکل گیا اور گرے پڑے لوگ بھی مدینہ سے چلے گئے۔

اب یہ حالت ہوگئی تھی کہ جب میں مدینہ کے بازاروں میں نکلتا تو مجھے اپاہج لوگوں اور منافقوں کے سوا کوئی نظر نہ آتا۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک پہنچ گئے اور آپ نے وہاں پہنچکر مجھے یاد فرمایا۔

مافعل کعب بن مالکؓ کعب بن مالک نے یہ کیا کیا۔

بنو سلمہ میں سے ایک شخص نے کہا :- یا رسول اللہ ۔ کعب کو اچھے کپڑوں اور تن آسانی نے روک لیا ۔ حضرتِ معاذ بن جبل رضؓ یہ سُنکر بولے۔

بئسما قلت ۔ واللہ یا رسول اللہ ما علمنا علیہ الا خیر

تم نے یہ صحیح نہیں کہا ۔ خدا کی قسم یا رسول اللہؐ، ہمارا خیال کعب کی نسبت بہتر ہی ہے

سرورِ عالم معاذ بن جبل کے الفاظ سنکر خاموش ہو گئے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس ہوئے، جب مجھے آپ کے واپس آنے کا علم ہوا تو میں ایسے حیلے بہانے سوچنے لگا جنھیں پیش کر کے میں سرورِ عالم کے غصّے سے محفوظ رہ سکوں۔

اِس سلسلے میں میں نے اپنے گھر والوں سے بھی مشورہ کیا یہانتک کہ حضور مدینہ کے قریب آگئے ۔ آپ کے قریب آجانے کی اطلاع نے مجھ پر ایسا رُعب طاری کر دیا کہ وہ تمام حیلے بہانے جو میرے دِل میں جمع ہوئے تھے ختم ہو گئے اور میں نے سمجھ لیا کہ جھوٹ سے مجھے نجات نہیں مل سکتی، سچ ہی کے ذریعہ میں عتابِ الٰہی سے بچ سکتا ہوں۔ بالآخر سرورِ عالم تشریف لے آئے اور حسبِ عادت مسجد میں دُو رکعت نماز ادا کر کے وہیں بیٹھ گئے۔

اب وہ لوگ آپ کے پاس آنے شروع ہوئے جو غزوہ سے رہ گئے تھے ان کی تعداد اسّی سے کچھ زائد تھی، یہ اپنے شریک نہ ہونے پر طرح طرح کے عذر پیش کرنے لگے، سرورِ عالم اِن کے جھوٹے سچے حیلے بہانے سنتے اور ان کی باطنی حالت کو خدا کے سپرد کر کے انھیں معاف فرما دیتے ۔ میں بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، سلام عرض کیا ۔ آپ نے غضبناک انداز میں تبسم فرمایا اور اپنے ۔

پاس بلا کر مجھے اپنے سامنے بٹھالیا پھر فرمایا۔ کعب! تم کیسے رُکے تم نے تو سواری بھی خرید لی تھی۔ میں نے عرض کیا۔ حضور! اگر میں آپ کے سوا کسی اور کے سامنے ہوتا تو بیسیوں جھوٹی باتیں بنالیتا اور حیلے بہانے بنانے میں کسی سے پیچھے نہ رہتا لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر آج جھوٹ بول کر میں آپ کے غصے سے نجات پا جاؤں تو ممکن ہے کل خدا تعالیٰ آپ کو حقیقتِ حال سے مطلع کردے اور آپ پھر مجھ سے ناراض ہو جائیں۔ تو مجھے اُمید ہے کہ خدا تعالیٰ میری سچائی کی بنا پر آپ کو پھر مجھ سے خوش کرے گا۔

حضور! سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے کوئی عذر نہ تھا، بلکہ اس موقع پر مجھے جتنی فرصت اور آسانی میسّر تھی وہ اِس سے پہلے کبھی نہ تھی، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اما ھذا فقد صدق — اِس شخص نے سچ بولا ہے۔

فقم حتی یقضی اللہ فیکؕ — اچھا! تم جاؤ! یہاں تک کہ خدا تعالیٰ ہی تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ صادر فرمائے

میں یہ سنکر کھڑا ہو گیا، میرے ساتھ بنو سلمہ کے چند آدمی اور اُٹھے، انھوں نے راستہ میں مجھ سے کہا۔ کعب! اِس سے پہلے تو تم سے کبھی ایسی خطا نہیں ہوئی، لیکن تعجب ہے کہ تم نے اوروں کی طرح کچھ عذر پیش کیوں نہ کئے۔ اگر حضور تمہارے لئے دعاءِ مغفرت کرتے تو تمہارے لئے وہ کافی تھا۔

یہ لوگ کچھ اس طرح میرے پیچھے پڑے کہ میرے دل میں پھر جھوٹے عذر پیش کر کے برأت حاصل کرنے کا خیال پیدا ہونے لگا لیکن میں نے ان لوگوں سے

پوچھا، اچھا۔! یہ تو بتاؤ۔ کہ اِس معاملہ میں میرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔؟ انھوں نے کہا۔ ہاں۔ دو شخص اور ہیں اور انھوں نے وہی جواب دیا ہے جو تم نے جواب دیا ہے۔ میں نے کہا وہ کون لوگ ہیں۔؟ وہ بولے مُرارہ بن ربیع عامری۔ اور ہلال بن اُمیہ واقفی ہیں۔ جب میں نے اِن دونوں نیک صحابیوں کا نام سُنا جو بدر میں شریک ہو چکے تھے تو مجھے پورا اطمینان ہو گیا اور میں اپنے گھر چلا گیا۔

اِس کے بعد سرورِ عالم نے عام حکم دیدیا کہ ہم تینوں آدمیوں سے کوئی بات نہ کرے، حضور کی ہدایت کے مطابق مسلمانوں نے ہم سے بالکل بات چیت بند کر دی، لوگوں کی نگاہیں پھر گئیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مدینہ کی سرزمین بالکل بدل گئی ہے اور میں اپنے دیس میں پردیسی ہو گیا ہوں

فاجتنبنا الناس وتغیرو لنا حتی تنکرت فی نفسی۔

الارض فیما ھی بالارض التی کنت اعرف

کعب کہتے ہیں مجھے سب سے زیادہ اِس کا فکر تھا کہ میں اِس حال میں مر گیا تو حضور جنازہ کی نماز بھی نہ پڑھیں گے اور خدا نخواستہ حضور کا وصال ہو گیا تو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایسا ہی رہوں گا۔ نہ کوئی مجھ سے کلام کرے گا نہ میری نماز پڑھے گا، کیونکہ حضور کے اِرشاد کے خلاف کون کر سکتا ہے

پچاس راتیں ہم پر اِسی طرح گزر گئیں، وہ دونوں بدری بزرگ تو ہار تھک کر اپنے مکانوں میں بیٹھ گئے، رات دن روتے تھے اور گھر سے باہر نہ نکلتے تھے، لیکن میری طبیعت ذرا سخت تھی، میں بازاروں میں پھرتا تھا،

اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔

نماز سے فارغ ہوکر حضور لوگوں کے ساتھ مسجد میں تشریف فرما ہوتے میں حاضر ہوتا اور سلام کرتا اور یہ دیکھتا رہتا کہ میرے سلام کے جواب میں حضور کے ہونٹ بھی ہلے کہ نہیں۔ پھر آپ کے قریب ہی کہیں بیٹھ جاتا اور کنکھیوں سے آپ کو دیکھتا رہتا کہ آپ کی نگاہیں مجھ پر کیسی پڑتی ہیں مگر وہاں حال یہ تھا کہ جب تک میں نماز پڑھتا آپ میری طرف دیکھتے رہتے اور جہاں میں نے سلام پھیرا آپ نے میری طرف سے نگاہ ہٹالی۔

یہ مکمل بائیکاٹ جاری تھا کہ اسی دوران میں ایک روز میں گھبرا کر اپنے چچا زاد بھائی ابو قتادہ کے پاس گیا مجھے اُن سے بڑی محبت تھی، میں ابو قتادہ کے باغ کی دیوار پھاند کر اُن کے پاس پہنچا، سلام کیا، لیکن خدا کی قسم اُنھوں نے بھی مجھے جواب نہ دیا، ——— میں نے کہا۔ ابو قتادہ! میں تمھیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں۔ کیا میں خدا اور اس کے رسول سے محبت نہیں رکھتا۔ ؟ وہ خاموش رہے، میں نے پھر پوچھا، وہ پھر خاموش رہے، جب تیسری دفعہ میں نے قسم دے کر بھی سوال کیا تو اُنھوں نے بس اتنا کہا۔ کہ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے ——— اس پر میں بے قابو ہوگیا اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور دیوار سے اتر کر واپس آگیا

اسی اثنا میں ایک واقعہ اور پیش آیا۔ ایک روز میں مدینہ کے بازار میں سے گزر رہا تھا، میں نے دیکھا کہ شام کے نبطیوں میں سے ایک شخص لوگوں سے پوچھ رہا ہے کہ کعب بن مالک کہاں ملیں گے۔

لوگوں نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ کہ یہ ہیں کعب بن مالک وہ میرے پاس آیا اور مجھے شاہ غسّان کا ایک خط دیا، میں لکھنا پڑھنا جانتا تھا، خط کھولا تو اس میں یہ لکھا ہوا تھا۔

امابعد بلغنا ان صاحبک قد جفاک وان اللہ لم یجعلک ذاھوان ولا مضیعۃ فالحق بنا نواسک

ہم نے سُنا ہے کہ تمہارے صاحب نے تم پر ستم توڑ رکھا ہے، تم کوئی گرے پڑے آدمی نہیں ہو کہ تمھیں ضائع کیا جائے تم ہمارے پاس چلے آؤ۔ ہم تمہاری قدر کریں گے

میں نے خط پڑھ کر اپنے دل میں کہا یہ ایک اور بلا نازل ہوئی، گھر گیا اور خط کو چاک کر کے چولھے میں ڈال دیا۔

اِس حالت پر چالیس دن گذر گئے تھے ایک روز حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد میرے پاس آیا اور مجھے حضور کا یہ حکم سنایا کہ تم اپنی بیوی سے علیحدہ ہو جاؤ، میں نے پوچھا، کیا طلاق دیدوں۔؟ قاصد نے کہا نہیں بس اُس سے الگ رہو، میں گھر آیا اور بیوی سے کہا تم اپنے میکے چلی جاؤ اور جب تک خدا تعالیٰ میرے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کرے وہیں رہو۔

سرورِ عالم کا یہ حکم میرے دوسرے ساتھیوں کے پاس بھی پہنچا تھا، ان میں ہلال بن امیہ بہت ضعیف تھے، اُن کی بیوی حضور کی خدمت میں حاضر ہوئیں، عرض کیا —— یا رسول اللہ۔! میرے خاوند بہت بوڑھے ہیں، کمزور ہیں اور میرے سوا گھر میں دوسرا خادم نہیں ہے، اگر جناب اجازت دیں تو میں اُن کی خدمت کیا کروں،۔ آپ نے فرمایا۔ کام کاج کرو۔ کوئی حرج نہیں

لیکن وہ تم سے ملیں نہیں - عرض کیا حضور - ! اول تو وہ بہت ضعیف ہیں، اور پھر -

واللہ واللہ مازال یبکی منذ کان من امرہ ما کان الی یومہ ھذا

جب سے یہ بات ہوئی ہے، خدا کی قسم وہ برابر رو رہے ہیں آج تک اُن کے آنسو نہیں تھمے ،۔

میرے گھر والوں نے مجھ سے یہی کہا کہ تم بھی حضور سے اتنی اجازت حاصل کر لو جتنی حضرت ہلال کو ملی ہے ،۔ میں نے کہا ــــ میں جوان آدمی ہوں میں اس بارے میں حضور سے کچھ نہیں کہہ سکتا، نہ جانے حضور جواب میں کیا ارشاد فرمائیں -

پچاسویں دن صبح کی نماز کے بعد میں اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا حالت یہ تھی کہ زندگی سے بے زار تھا، زمین مجھ پر تنگ تھی کہ سلع پہاڑی سے ایک پکارنے والے کی آواز آئی -

ابشر یا کعب بن مالک

مبارک ہو، اے کعب بن مالک -!

میں یہ سنتے ہی سجدہ میں گر گیا اور سمجھ گیا کہ میری معافی کا حکم آ گیا ہے اور حقیقت بھی یہی تھی کہ صبح کی نماز کے بعد سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول توبہ کی خبر صحابۂ کرام کو دی تھی، اور صحابہ یہ سنکر پیدل اور سواریوں پر ہم تینوں کو یہ خوش خبری سنانے کے لئے دوڑ پڑے تھے -

میں اپنی معافی کی خبر سنکر اس قدر خوش ہوا کہ مبارک باد دینے والے کو میں نے اپنے کپڑے اتار کر دیدیئے، خدا کی قسم اس وقت میرے پاس تن کے کپڑوں کے

سوا کچھ نہ تھا، چنانچہ اس کے بعد مجھے جسم ڈھانکنے کے لیئے دو کپڑے مستعار لینے پڑے، اب گھر سے نکلا اور مسجد نبوی کی طرف چلا، راستہ میں مجھے لوگوں کے کئی ہجوم ملے اور مجھے مبارک باد دی، میں مسجد نبوی میں پہنچا دیکھا کہ سرور عالم تشریف فرما ہیں اور صحابۂ کرام آپ کے گرد جمع ہیں، مجھے دیکھتے ہی صحابۂ کرام میں سے حضرت طلحہؓ[1] بن عبداللہ دوڑے ہوئے میرے پاس آئے، مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے مبارک باد دی۔

میں نے سرور عالم کو سلام کیا، آپ کا چہرہ خوشی کے مارے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ آپ نے فرمایا۔

ابشر بخیر یوم مر علیک منذ ولدتک امک — کعب مبارک ہو! آج کا دن تیری زندگی میں سب سے بہتر دن ہے،۔

میں نے عرض کیا۔

امن عندک یا رسول اللہ ام عند اللہ۔ — یہ معافی حضور کی طرف سے ہے یا خدا تعالیٰ کی طرف سے۔

فرمایا۔ خدا کی طرف سے

سرور عالم کو جب کوئی خوشی ہوتی تو آپ کا روئے انور چاند کا ٹکڑا معلوم ہوتا اور ہر شخص چہرہ انور کو دیکھ کر جان لیتا کہ حضور کو خوشی ہوئی ہے۔

---

[1] طلحہ بن عبداللہ رضؓ ان کے دینی بھائی تھے، سرور عالم نے ہجرت کے بعد کعب کے ساتھ ان کا بھائی چارہ قائم کیا تھا، کعب کہتے ہیں، طلحہ کا یہ احسان مجھے زندگی بھر یاد رہے گا (سیر الصحابہ)

میں نے عرض کیا حضور۔! میری توبہ میں کیا یہ بھی شامل ہے کہ میں اپنا سارا مال خدا کی راہ میں صدقہ کر دوں ـــــ فرمایا ـــــ کچھ صدقہ کر دو۔ اور کچھ رہنے دو، یہی بہتر ہے، پس میں نے اپنا خیبر کا حصہ رکھ لیا اور باقی تمام صدقہ کر دیا، پھر میں نے عرض کیا۔ حضور۔! خدا تعالیٰ نے راست گفتاری کی برکت سے مجھے نجات دی ہے، میں اب اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ زندگی بھر سچائی پر قائم رہوں گا، میرا ایمان ہے کہ سچ کی وجہ سے جو نعمت خدا تعالیٰ نے مجھے عطا کی ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں دی۔

الحمد للہ کہ اس وقت سے آج تک میں نے جھوٹ نہیں بولا اور مجھے اُمید ہے کہ عمر کے باقی حصہ میں بھی خدا تعالیٰ مجھے اس سے محفوظ رکھے گا۔

(رواہ البخاری والمسلم)

کعب بن مالک کی شخصیت

جنھوں نے اپنی زبانی یہ اپنا واقعہ بیان کیا ہے وہ معمولی حیثیت کے آدمی نہیں ہیں ـــــ خزرج جو مدینہ کا بڑا با اثر قبیلہ تھا اس کے ذی عزت فرد تھے، اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی خدمات کی وجہ سے مسلم سوسائیٹی میں ایک خاص جگہ حاصل کر لی تھی۔

عقبہ ثانیہ اسلام کی آئندہ کامیابیوں کا دیباچہ تھا اس میں شریک رہے اور مکہ جا کر حضور کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اُحد کے میدان میں سرور عالم کی زرہ پہن کر شجاعت کے جوہر دکھائے اور اتنی بے جگری سے لڑے کہ گیارہ زخم کھائے۔

اُحد میں دشمنوں نے یہ افواہ اُڑادی کہ حضور شہید ہو گئے، صحابہ کرام میں سخت بے چینی پھیل گئی، کعب بھی مضطربانہ حالت میں گھوم رہے تھے کہ اچانک حضور پر ان کی نگاہ پڑ گئی ۔ یہ پکار اُٹھے ۔ لوگو حضور زندہ سلامت ہیں

کعب کو شاعری کے شوق نے دربارِ رسالت کے مقبول ترین شاعروں میں شامل کر دیا تھا کیونکہ ان کی شاعری گل و بلبل کی شاعری نہ تھی بلکہ ان کی شاعری کا موضوع دشمنانِ حق کے دلوں میں اسلام کی عظمت و شوکت اور سطوت کا سکہ جمانا تھا، ان کے کلام میں قدرت نے بڑا اثر پیدا کیا تھا، ایک مرتبہ انھوں نے دو شعر کہے اور ان سے پورا کا پورا قبیلہ دوس مسلمان ہو گیا۔

قضینا من تہامۃ کل وبز ٭ وخیبر ثم اعمدنا السیوفا

یخبرھا ولو نطقت لقالت ٭ فواطعھن دوسا او ثقیفا

(۱) تہامہ اور خیبر سے ہم نے کینہ کو دُور کر کے تلواریں نیام میں کر لیں۔

(۲) اب پھر ہم اُن کو اُٹھاتے ہیں اور اگر بول سکیں تو کہیں کہ اب دَوس یا ثقیف کا نمبر ہے

اس عظمت کے باوجود حضرت کعب کو اتنی سخت سزا دی گئی کسی غداری کے جرم میں نہیں، صرف ادائے فرض کے تساہل کے جرم میں اس لئے کہ جب اسلام اور کفر کے درمیان کشمکش برپا ہو، باطل کے مقابلہ میں اہل حق کی آبرو کا سوال ہو تو اس موقعہ پر بڑے سے بڑا دیندار شخص بھی اگر معمولی غفلت برت جائے تو اس کی زندگی بھر کی نیکیاں اور خدمات خطرے میں پڑ جاتی ہیں خواہ وہ کتنا ہی نیک نیت کیوں نہ ہو۔ مومن کے لئے یہی موقع ہوتا ہے جبکہ اس کی صداقت ایمانی کو آزمایا جاتا ہے۔

هنالك ابتلی المومنون و زلزلوا زلزالا شدیدا

اس معاملہ میں بہت سے منافقین بھی ہیں جن کی غدّاریاں عیاں ہو چکی تھیں لیکن ان کی ظاہری عذرداریاں سنکر انھیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے، کیونکہ جن سے خلوص کی اُمید ہی نہ ہو اُن سے عدم خلوص کی شکایت کیا ـــــ؟ لیکن وہ مومن جس کا ایمان و اخلاص ذرّہ برابر مشتبہ نہ تھا وہ پوری سچّائی کے ساتھ اپنے قصور کا اعتراف کرتا ہے لیکن اُس پر غضب کی بارش برسا دی جاتی ہے کیونکہ اس پر حفاظتِ حق کی ذمہ داری ہے اور یہی ہے جسے خدا تعالیٰ نے محکمہ عالم میں اپنی سچائی پر گواہ صادق اور شاہد حال بنا کر بھیجا ہے۔

وکذالك جعلنا کم امۃ وسطا لتکونوا شهداء علی الناس۔

غیر کے مقابلے میں اپنے کی ادنیٰ لغزش بھی قیامِ حق کی جد و جہد کو نقصانِ عظیم پہنچاتی ہے۔ مخلصانہ توبہ بلا تاخیر قبول ہوتی ہے۔

اَلَمْ یعلموا ان اللّٰہ یَقبل التوبہ

اور ایک نیکوکار کے بہت سے گناہ ـــــ یوں ہی معاف کر دیئے جاتے ہیں

وَیَعْفُوْ عَنْ کَثِیْرٍ ط

لیکن کعب کی توبہ کے معاملہ کو پچاس دن تک موخر رکھا گیا صرف اس لئے کہ اس سے دوسروں کو عبرت ہو اور مجرم کو اچھی طرح تنبیہ ہو جائے،

قابل تعریف ہے وہ پیروکارِ اخلاص و استقلال جو سزا کی سختی سے تڑپ رہا ہے اس کی زندگی اُس کے لئے دُوبھر ہو چکی ہے، سب چھوڑ کر اس سے علیٰحدہ ہو چکے ہیں مگر اس کا قدم جادۂ اطاعت سے ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں ڈگمگاتا

نہ نفس میں غرور پیدا ہوتا ہے، نہ علانیہ سرکشی پر اُترتا ہے اور نہ اپنے محبوب امیر کے خلاف جلوت وخلوت میں کوئی شکایت زبان پر لاتا ہے کیونکہ وہ ایمان کی اصل حقیقت کو سمجھتا ہے

فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فی ما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیما

غم وغصہ تو کیا ہوتا وہ تو اپنے امیر کی محبت میں پہلے سے زیادہ سرشار ہوگیا ہے سزا کے پچاس دن اُس نے اس طرح گذارے ہیں کہ اس کی آنکھیں بے تاب ہو ہو کر اس چیز کو دیکھتی تھیں کہ میرے آقا کی آنکھوں میں میرے لئے وہ گوشہ التفات بھی باقی ہے یا نہیں جو میری زندگی کا آخری سہارا ہے۔

اتی رسول اللہ وھو فی مجلسہ بعد الصلوٰۃ فاسلم واقول فی نفسی احرک شفتیہ برد السلام علیّ ام لا۔؟

میں حضور کے پاس آتا آپ نماز کے بعد مجلس میں تشریف فرما ہوتے، میں سلام کرتا اور اپنے جی میں کہتا کہ سلام کے جواب میں آپ کے مبارک ہونٹ ہلے یا نہیں۔؟

ثم اُصلی قریبا منہ واسارقہ النظر فاذا اقبلت علی صلوتی نظر الی فاذا التفت نحوہ اعرض عنی

میں پھر آپ کے قریب نماز پڑھتا اور آنکھیں چرا چرا کر آپ کو دیکھتا رہتا پس میں جب تک نماز پڑھتا رہتا آپ مجھے دیکھتے رہتے اور جب میں آپ کی طرف دیکھتا تو منہ پھیر لیتے

پھر اسی حالت میں حضرت کعب کی ایک اور سخت آزمائش ہوتی ہے۔

ایک دشمنِ دین اِن کی حالت سے ناجائز فائدہ اُٹھاکر عیش و آرام، عزت و دولت اور جاہ و منزلت کی پیش کش کرتا ہے انسانی زندگی میں اِس سے بڑھ کر کوئی دوسرا پر خطر موقعہ نہیں، جاہ و زر کا لالچ وہ طلسمی زنجیر ہے جسے انسان مسکراتا ہوا خود دشمن کے ہاتھ سے لے کر اپنے پاؤں میں ڈال لیتا ہے، لیکن وہ مردِ مومن حُبِ مال و جاہ کے لئے خدا کی محبت کو نہیں ٹھکراتا۔ عیش فانی کے لئے صداقت کی لازوال دولت نہیں چھوڑتا اور باطل کی ـــــ ترغیبات کو نفرت و حقارت سے ٹھکرا کر اِسلام کی سچائی پر قائم رہتا ہے یہ سچی حنیفیت تھی جسے اِس جملہ میں بیان کیا ہے ـــ وظنوا ان لا ملجاء من اللّٰہِ اِلا اِلیہ ثم تاب علیھم لیتوبوا

حضرتِ کعب نے غصہ و عناد میں جماعت میں انتشار نہیں پھیلایا ـــ بد دل ہوکر کوئی نئی پارٹی نہیں بنائی بلکہ ایک سچے وفادار عاشق کی طرح اس دروازے پر پڑے رہے جہاں سے اُنھیں دھکے دیئے جارہے تھے ـ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ یہیں کی ٹھوکریں کھائیں گے کیونکہ آستانہ احدیت کے سوا کوئی آستانہ نہیں جہاں پناہ ملے اور کوئی بارگاہ نہیں جہاں شکستہ دلوں کے لئے سکون و تسلی کا سامان موجود ہو۔ ولا یجد لہ من دون اللّٰہِ ولیاً ولا نصیراً ط

پس پھر کیا تھا جن بندوں سے آقا نے نظر پھیر لی تھی جب اُنھوں نے چوکھٹ سے سر نہ اُٹھایا اور در پر پڑے رہے تو ان کی شان وفاداری دیکھ کر آقا سے رہا نہ گیا اور جوشِ محبت سے بے قرار ہوکر وہ آپ باہر نکل آیا۔ اور

انھیں دروازے سے اُٹھا کر گلے سے لگا لیا، الفاظ کس قدر محبت بھرے استعمال کئے ہیں ـــــ" ہم ان کی طرف پلٹے تاکہ وہ ہماری طرف پلٹیں۔

ثم تاب علیھم لیتوبوا

لیڈر کا طرزِ عمل

پیرو کے ساتھ لیڈر کے طرزِ عمل پر بھی غور کیجئے وہ نہایت سخت سزا دے رہا ہے لیکن غصّہ و نفرت کے ساتھ نہیں محبت و الفت کے گہرے جذبات کے ساتھ مقصد اُس کو تکلیف دینا نہیں، اس کے نفس کو کمزوریوں کے اثر سے پاک کر کے مستقبل کے خطرات سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کرنا ہے، یہ رحمت ہے عذاب نہیں۔

ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ ما زکی منکم من

احد ولکن اللہ یزکی من یشاءُ (نور)

یہی وجہ ہے کہ جب تک گنہگار اُمتی نماز پڑھتا رہتا ہے تو اس وقت تک سردار اپنی محبت بھری نگاہوں سے برابر اُسے دیکھتا رہتا ہے لیکن وہ محبت ڈسپلن کے تقاضے پر غالب نہیں آتی۔

جماعتی ڈسپلن

جماعتی ڈسپلن کی یہ حالت ہے کہ اِدھر سردار کی زبان سے بائیکاٹ کا حکم نکلا ادھر پوری جماعت نے مجرم کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں، زمین تنگ ہو گئی اپنے پرائے بن گئے، بچپن کا دوست منھ پھیر لیتا ہے اور جب خدا کا واسطہ دے کر پوچھا جاتا ہے کہ میرے خلوص میں تمھیں شبہ ہے تو صاف جواب ملتا ہے کہ ہم سے کیا پوچھتے ہو خدا اور اس کے رسول سے اس کی سند حاصل کرو۔

تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان — کی کتنی اچھی تصویر ہے۔

پھر جماعت کا یہ طرزِ عمل کسی دلی عناد پر مبنی نہیں، کسی بد دیانتی کو اس میں دخل نہیں، بلکہ یہ سب کچھ — الحب للہ والبغض للہ — کے ماتحت ہے جس کا نتیجہ ہے کہ زمانہ عتاب میں کوئی شخص ان کے خلاف کوئی لفظ منھ سے نہیں نکالتا، یہ کوشش نہیں کی جاتی کہ اگر آج امیر ناراض ہے تو دوسے مجرم کے متعلق اور بدگمان کر دیا جائے اس کی حالت سے فائدہ اُٹھا کر اس کے اثر و رسوخ کو کم کر دیا جائے بلکہ ہر چھوٹا بڑا اپنے معتوب بھائی کی مصیبت پر رنجیدہ ہے۔ اور اس کو پھر سے گلے لگانے کے لیے بے تاب ہے چنانچہ اِدھر معافی ہوئی اور اُدھر ہر شخص خوش خبری سنانے کے لئے دَوڑ پڑا، یہ ہے نمونہ اس معاشرہ کا جسے اسلام دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے اور ایمان و اسلام کا اس کے سوا کوئی دوسرا مطالبہ بھی نہیں کہ کوئی شخص حق و صداقت کے مقابلہ میں اثرِ محبت سے مسحور نہ ہو، ہر فرد علاقہ حق کے سوا باقی تمام علاقوں کی بندش سے آزاد ہو۔

لا تجد قوماً یومنون باللہ والیوم الاخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا اٰباءھم وابناءھم و اخوانھم او عشیرتھم اولٰئک

تو نہ پائے گا کسی قوم کو جو یقین رکھتے ہوں اللہ پر اور پچھلے دن پر کہ دوستی کریں ایسوں سے جو مخالف ہوئے اللہ کے اور اس کے رسول کے خواہ وہ اپنے بیٹے یا اپنے بیٹے یا اپنے بھائی یا

کتب فی قلوبھم الایمان و ایدھم بروح منہ (سورہ مجادلہ) — اپنے گھرانے کے، ان کے دلوں میں اللہ نے لکھ دیا ایمان اور ان کی مدد کی ہے اپنے غیب کے فیض سے

یہی وہ افراد ہیں جن کی آواز دلوں کو تھرا دیتی ہے جن کی راستبازی شریروں کو مرعوب کر دیتی ہے اور جن کی صدق شعاری سے فتنہ انگیز ہر وقت خوف زدہ رہتے ہیں۔

جو لوگ اپنے نفس کو معاف نہ کرتے ہوں، اپنی خطاؤں سے درگذر نہ کرتے ہوں وہ لڑائی کے معاملہ میں دوسروں کے ساتھ کیا مداہنت کر سکتے ہیں؛۔ ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین

حضرت سلمہ بن صخرہؓ نے ماہ رمضان میں اپنی بیوی سے ظہار کیا، یعنی ایک ماہ کے لئے تعلقات منقطع کر لئے۔ اتفاق سے ایک دن بیوی عبادت میں مصروف تھیں کہ سلمہ نے ان سے مقاربت کر لی: حضرت سلمہؓ اس غلطی پر بہت نادم ہوئے، پہلے اپنی قوم کو اس غلطی سے آگاہ کیا اور کہا مجھے حضور کے پاس لے چلو، لوگوں نے انکار کیا، تو خود حاضر ہوئے سارا واقعہ سنایا۔

آپ نے فرمایا، تم اور ایسا کام، بولے ہاں یا رسول اللہ، خدا کے حکم پر میں صابر رہوں گا، میرے متعلق جو فیصلہ ہو وہ مجھ پر نافذ فرمایئے۔

(ابو داؤد، کتاب الطلاق)

حضرت ابولبابہ سے میدانِ جنگ میں ایک غلطی ہو گئی، اس قدر شرمندہ ہوئے

کہ حضور کے پاس واپس بھی نہ گئے اور وہاں سے سیدھے مدینہ چلے آئے اور
اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستون سے باندھ دیا اور عہد کیا جب تک حضور
خود نہ کھولیں گے میں اسی طرح بندھا رہوں گا۔ چھ دن تک بندھے رہے
ان کی بیوی انھیں صرف نماز کے لئے کھولا کرتی تھیں چھ روز کے بعد وحی الٰہی
نے ان کی خطا معاف فرمائی تب حضور نے اپنے دست مبارک سے انھیں کھولا۔
حاسۂ اخلاق کی یہ بیداری کسی ظاہری دباؤ کا نتیجہ نہیں بلکہ اس تصور
کی کارفرمائی ہے کہ ہر تاریکی اور تنہائی میں ایک ایسا حاضر موجود ہے جو
کبھی غائب نہیں ہوتا اور ہر پردے اور دیوار کی اوٹ میں اُسے ایک ایسا ناظر
دیکھ رہا ہے جس کی نظر سے وہ کبھی اوجھل نہیں ہو سکتا۔

ان ربک لبالمرصاد

موجودہ سوسائٹی

اس کے مقابلہ میں ایک وہ معاشرہ ہے
جسے تہذیب جدید نے آب و تاب بخشی ہے
اور جس کا مدت سے انسان تجربہ کر رہا ہے اس میں جس قدر قانون و آئین کا چرچا
ہے اُسی قدر زندگی کے ہر گوشہ میں بے آئینی اور بدنظمی ہے
ہر شخص خود غرضی کا شکار ہے اگر قومی اور ملکی مفاد کا نعرہ ہے تو وہ بھی
محض ذاتی اغراض کے حصول کے لئے نہ کسی کا خوف ہے نہ اندیشہ، ہر دل نفاق
اور ریاکاری کا نشیمن ہے ایک کو دوسرے پر نہ اعتماد ہے نہ بھروسہ، نفع و
نقصان، عدل و انصاف کا خالص انسانی نقطۂ نگاہ نہ صرف معدوم بلکہ جرم
ہے جس کی سزا دورِ وحشت سے بھی زیادہ سخت ہے۔

پوری سوسائٹی کا یہی رنگ ہے اور وسائل تمدن کی ساری فراوانی خودغرضوں کی آلۂ کار ہے، پھر ظلم کے خلاف کون آواز اُٹھائے، بُرائی پر کون کسے ٹوکے، امن و انصاف کے لئے کون سر دھڑ کی بازی لگائے۔

بس یہی وہ وقت ہے جب توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں — ثم لتدعونہ فلا یستجاب لکم — فطرت اپنی مدد کا ہاتھ کھینچ لیتی ہے، تسٰاء لونی فلا اعطیکم — اور پھر بالآخر انسان کو اس کے تکبر — کی سزا دینے کے لئے بھوک، خوف، نقصان جان و مال کے خوفناک جنگل میں پھنسا دیا جاتا ہے کیونکہ اس کے بغیر انسانیت کی بقا ممکن نہیں، قدرت کے نظام میں قوموں اور ملکوں کو اہمیت حاصل نہیں، انسانیت کو عظمت حاصل ہے جس کا بچاؤ خود قدرت کا ایک مقدس فرض ہے اور وہ اس کی حفاظت کے لئے جب حرکت میں آتی ہے تو نہ تہذیب و تمدن کے ایوانوں کو چھوڑتی ہے اور نہ علم و ادب کے کاشانوں کو اور نہ عبادت گذاروں کے خلوت کدوں کو کیونکہ یہ سب کچھ انسانیت کے لئے ہے نہ انسانیت ان کے لئے۔

حضورؐ بہترین سپہ سالار کی حیثیت سے

مجاہدِ بدر و اُحد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے مکمل دین (اسلام) سے پہلے مذہبی دنیا کا یہ عام خیال تھا کہ روح و روحانیت کی ترقی کے لئے جسم کو مٹا دینا ہی سب سے بڑی

خدا پرستی ہے، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو بتایا کہ روح کی طرح جسم بھی خدا کی امانت ہے اور خدا کا حکم یہ ہے کہ میری دونوں امانتوں کی حفاظت کی جائے، نہ جسم و جسمانیت کی خاطر روح کو مردہ کرو، نہ روحانیت کی خاطر جسم کو ہلاک کرو، تعلیم کے علاوہ حضور نے اپنی عملی زندگی سے بھی لوگوں کو یہی سبق دیا۔

حضور سب سے بڑے روحانی اِنسان تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ آپ اپنے جسم کی صحت اور طاقت کا بھی پورا پورا خیال رکھتے تھے ـــــ بچپن میں آپ نے تیرنا سیکھا، مدینہ میں اپنے ننھیالی مکان کے سامنے سے جب آپ گذرا کرتے تو ایک تالاب کی طرف اِشارہ کر کے فرمایا کرتے تھے ـــــ میں نے اِس تالاب میں تیرنا سیکھا ہے اور میں اسی میدان میں انیسہ لڑکی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔[1]

رُکانہ عرب کا مشہور پہلوان تھا یہ ایک روز مکہ کی ایک گھاٹی میں حضور کو مل گیا، آپ نے اس کے سامنے اِسلام پیش کیا۔ وہ بولا۔ محمد! اگر مجھ پر حق ظاہر ہو جائے تو میں آپ کی صداقت کو تسلیم کر لوں گا، وہ پہلوان آدمی تھا، علم اور دلیل سے اُسے کیا واسطہ تھا، آپ نے اُسی کے ذہن کے مطابق فرمایا ـــ اچھا اگر میں تجھے زیر کر دوں تو تو مجھے نبی مان لے گا۔ اُس نے اقرار کر لیا، حضور تیار ہو گئے، دونوں کی کشتی ہوئی، حضور نے رُکانہ کو زیر کر دیا، رُکانہ کو بڑی حیرت ہوئی کیونکہ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ "محمد" روحانی آدمی ہیں ان میں جسمانی طاقت

---

[1] ابن سعد جلد اص ۳۰

کہاں ہو گی ؟ — لیکن اس کی رائے غلط نکلی، وہ پھر کھڑا ہوا اور بولا۔ ایک دفعہ اور لڑوں گا۔ حضور پھر لڑے اور پھر اُسے زیر کر دیا، اب اسے یقین آگیا کہ میں "محمد" سے نہیں جیت سکتا، حضور نے عہد یاد دلایا، رکانہ عہد سے پھر گیا اور کہتا ہوا چلا گیا — تم جادوگر ہو — بڑے جادوگر۔[1]

حضور کو شہسواری کا اور تیر اندازی کا بہت شوق تھا، صحابۂ کرامؓ کو آپ اِس کی ترغیب دیتے تھے اور شوق دلاتے تھے اور اپنے سامنے لوگوں سے مشق کراتے تھے، ۔ ایک غزوہ میں حضرتِ عائشہؓ حضور کی رفیق سفر تھیں، راستہ میں آپ نے صحابہ کو حکم دیا۔ سب آگے بڑھ جاؤ، سب آگے بڑھ گئے آپ پیچھے رہ گئے، پھر حضرتِ عائشہ سے فرمایا۔ آؤ عائشہ دوڑ لگائیں، حضرتِ عائشہؓ تیار ہو گئیں، آپس میں دوڑ ہوئی حضرتِ عائشہؓ دُبلی پتلی تھیں، حضور بھاری تھے، یہ آگے نکل گئیں، کئی سال کے بعد پھر اِسی قسم کا موقعہ آیا، حضرتِ عائشہ فرماتی ہیں اب میں بھاری ہو گئی تھی اب جو ہم دونوں دوڑے تو حضور آگے نکل گئے، اِس پر فرمایا۔

"عائشہ ! یہ اُس کا جواب ہے"[2]

حضور نے ارشاد فرمایا۔ قوی مسلمان خدا کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب ہے[3] — اِس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کی صحت اچھی ہو گی تو خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت اچھی طرح کر سکے گا — صحت خراب ہو گی تو اس میں سستی و کاہلی ہو گی،

---

[1] اصح السیر ص ۵۳ [2] سیرتِ عائشہ بحوالہ ابو داؤد [3] مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ و ترک العجز

حضور کی عام زندگی غریبانہ رہی ہے مگر آپ کی زندگی میں "اچھے کھانے" اور اچھے پہننے کا نمونہ بھی موجود ہے اور ایک مکمل زندگی میں اس کا ہونا بھی ضروری تھا، چنانچہ آپ نے دُودھ اور کھجوریں استعمال فرمائیں، اور امت کو بتایا یہ بہترین کھانا ہے۔

سبزیوں میں کدو کی بڑی تعریف فرمائی اور کہا اس سے غمگین قلب کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ خُرفہ کے ساگ کے متعلق فرمایا۔ یہ دردِ سر کے لئے بہت مفید ہے،۔۔۔ کچے لہسن اور پیاز سے آپ ہمیشہ دُور رہے، صفائی، ستھرائی کو ایمان کا جُزو قرار دیا، لباس کے بارے میں فرمایا۔ سفید کپڑوں سے حلم و وقار ٹپکتا ہے۔

عام طور پر دنیا کا یہ خیال تھا کہ میلے کچیلے کپڑوں اور اوُل جلوُل ہیئت رکھنے والے لوگ بڑے پہنچے ہوئے ہوتے ہیں حضور نے اس خیال کو اپنے عمل سے غلط قرار دیا۔ آپ ہمیشہ صاف ستھرے رہتے تھے، بالوں میں کنگھی اور آنکھوں میں سرمہ لگانے کا اہتمام رکھتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دفاعی مہارت

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سال تک مکہ میں مظلومیت کی زندگی گذاری، آپ نے جب دیکھا کہ مشرکین کسی طرح دینِ حق کی اشاعت اور انسانیت کی اصلاح کے لیئے آپ کو کام کرنے کا موقعہ دینا نہیں چاہتے،

تو آپ نے مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی، مشرکین نے آپ کو مدینہ منورہ میں بھی چین سے کے ساتھ کام نہ کرنے دیا اور مدینہ پر جارحانہ حملے شروع کر دیئے۔ اب آپ نے مجبور ہو کر طاقت کا جواب طاقت سے دینے کا راستہ اختیار کیا،

اخلاق و درگذر کو کمزوری سمجھنے والے دشمنانِ حق جب تلوار اُٹھا کر میدان میں نکل آئے تو رسولِ پاک نے اپنے کمزور اور مادّی وسائل سے محروم ساتھیوں کو خدا کا نام لے کر اُن کے جبر و ظلم کو روکنے کے لئے میدان میں لا کھڑا کیا۔

حضور نے دو ہجری سے نو ہجری تک ۸ سال کے عرصہ میں تقریباً ۲۶ غزوات میں حصّہ لیا۔

پہلی بار بدر کے میدان میں قریش مکہ سے آپ کا مقابلہ ہوا، مسلمانوں کی تعداد صرف تین سو تیرہ تھی اور دشمنانِ حق ابوجہل جیسے سپہ سالار کی کمان میں ایک ہزار کی تعداد رکھتے تھے، مسلمان نہتے تھے اور دشمن تمام ساز و سامان سے لیس تھے اس کے باوجود رسول پاک جیسے عزم و حوصلہ رکھنے والے قائد کی رہنمائی میں مسلمان کامیاب ہوئے، صرف چودہ شہید ہوئے دشمن ستّر قتل کئے گئے اور ستّر ہی گرفتار ہو کر آئے۔

خندق کے میدان میں مسلمان صرف تین ہزار تھے اور دشمن دس ہزار رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے تدبّر اور شجاعت کی بدولت مسلمان فتحمند ہوئے اور دشمن ناکام لوٹے۔

خیبر کے مقابلے میں رسولِ پاک کی زیر کمان تیرہ سو مسلمان تھے اور

یہود دس ہزار کی تعداد میں نکلے تھے مگر اُنھیں شکست ہوئی۔

وادی القرار کے غزوے میں آپ کے ساتھیوں کی تعداد کُل تیرہ سو ۱۳۰۰ تھی، آپ نے اِس مقابلہ میں بھی دشمنوں کو پسپا کر دیا۔

حُنین کی لڑائی میں عرب کے بڑے بڑے قبائل مقابلے میں آئے آپ کے ساتھیوں کی تعداد صرف بارہ ہزار تھی، رسولِ پاک کی شجاعت اور تدبر کی بدولت حق کو فتح نصیب ہوئی، دشمن کے اکھتر آدمی قتل ہوئے اور چھ ۶ ہزار گرفتار کئے گئے۔

طائف کے غزوے میں بارہ ہزار ساتھیوں کے ساتھ آپ نے دشمن کا محاصرہ کیا اور ایک مہینے کے بعد دشمن آپ کی اطاعت کرنے پر خود بخود مجبور ہو گیا،

تبوک مقابلے میں رومی شہنشاہیت کے ناپاک ارادوں کو ناکام کرنے کے لئے رسولِ پاک تیس ہزار ساتھیوں کو لے کر نکلے، اور بڑے طاقتور دشمن پر اپنا رعب قائم کر کے واپس تشریف لائے۔ دشمن کو مقابلے کی ہمت نہ ہوئی۔

اُحد کے غزوے میں ساتھیوں کی کمزوری سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا، لیکن جب آپ نے بھاگتے ہوئے مسلمانوں کو للکارا تو مسلمان لوٹ آئے اور پھر چند منٹ میں میدانِ جنگ کا نقشہ پلٹ گیا۔

اُحد میں مسلمانوں کو ایسی ٹھوکر لگی کہ اُنھوں نے پھر رسولِ اکرم کی اطاعت میں کوتاہی نہ کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے بہادر کا بیان ہے۔

میں ہر جنگ میں رسول پاک کی پناہ لیتا تھا، ہم سب میں حضورِ اکرم ہی دشمنوں سے زیادہ قریب ہوتے تھے اور سب سے زیادہ بہادر وہی شخص

سمجھا جاتا تھا جو حضور سے زیادہ قریب ہوتا۔"

براہ راست جس دشمن سے آپ کا مقابلہ ہوا وہ اُبی بن خلف عرب کا مشہور سپہ سالار تھا، یہ آپ کا بدترین دشمن تھا، اُحد کے میدان میں اُس نے آپ کو للکارا، آپ کے ساتھی اس کی طرف بڑھے مگر آپ نے سب کو پیچھے ہٹا دیا اور اکیلے اُس کے مقابل ہو گئے، حضور نے پہل کر کے اُس کے ایک نیزہ مارا جو اُس کی گردن میں لگا، اس کے پاؤں اُکھڑ گئے اور بارا گیا، مارا گیا شور مچاتا ہوا زمین پر گر پڑا اور جہنم رسید ہو گیا۔

آپ کے بہادرانہ عزم کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ رات کے وقت مدینہ منوّرہ میں شور و غل کی آوازیں بلند ہوئیں، لوگ سمجھے دشمنوں نے حملہ کر دیا، صحابۂ کرام رضؓ شور کی جانب روانہ ہوئے آگے بڑھ کر کیا دیکھا کہ حضور تلوار گلے میں ڈالے گھوڑے پر سوار واپس آ رہے ہیں، آپ نے مسلمانوں کو دیکھ کر فرمایا۔ "گھبراؤ نہیں کوئی بات نہیں ہے۔"

غرضیکہ جس ذاتِ گرامی نے عفو و درگذر کی مثال قائم کی اُس نے مقابلے اور مدافعت کے میدان میں بہادرانہ عزم اور حوصلے اور بہترین جنگی مہارت کا بھی ثبوت پیش کیا ہے۔

حضورؐ رحم دِل اور کریم فاتح کی حیثیت سے

آنکہ بر اعدا درِ رحمت کشاد   مکہ را پیغام لاتثریب داد

جس دَور میں دوستوں کے لئے محبت میں خلوص باقی نہ رہا ہو اُس دَور میں دشمنوں کے ساتھ رحم وکرم کی مثال تلاش کرنا بالکل بے سود ہے، اس لئے کہنا پڑتا ہے، سب سے بہتر تھا وہ دَور جس دَور میں دشمنوں کو بھی محمد رسول اللہ جیسے رحم دل اور شریف فاتح نصیب ہوئے، محبت والے رہتی دنیا تک اُن کے نامِ پاک پر درود وسلام کے پھول نچھاور کریں گے جن کے نامِ پاک کے ساتھ بے لوث محبت اور بے غرض پیار کی یاد باقی ہے، شرافت اور اِنسانیت ہمیشہ اُن کے نام پاک پر فخر کرتی رہے گی اور شریف اِنسان خواہ کسی مذہب وملت کا ہو اُن کا نام عزت کے ساتھ لے گا

تم نے اوپر رسولِ پاک کی زندگی کے بہت سے رُخ دیکھے، اب دیکھو! ایک طاقتور فاتح جرنیل کی حیثیت سے۔

فتح مکّہ فتح مکّہ کا دن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا دن بھی ہے اور بے مثال عفو وکرم کا دن بھی، دس ہزار جاں نثاروں کے جلو میں رسول برحق صحابہ کرام کے لشکر عظیم کو لے کر مکہ کی طرف بڑھ رہے ہیں، مکہ جب ایک منزل دُور رہجاتا ہے تو رسول اکرم صحابۂ کرام کے لشکر کو قیام کرنے کا حکم دیدیتے ہیں، لشکر کے آنے کی بھنک قریش کے کانوں میں پڑجاتی ہے اور وہ حکیم بن حزام اور ابوسفیان کو حالات کی تحقیق کیلئے بھیجتے ہیں، سرکار کے خیمہ کی دربانی پر جو سپاہی متعین ہیں وہ ابوسفیان کو پکڑ لیتے ہیں، عمر کا جوش بے قابو ہوجاتا ہے دَوڑ کر حضور کے پاس آتے ہیں اور عرض کرتے ہیں، حضور! باطل کے ختم کرنے کا وقت آگیا ہے، ابوسفیان قابو میں ہے،

حکم دیجیے کہ سر قلم کر دوں۔ حضرت عباسؓ فوراً آڑے آتے ہیں اور کہتے ہیں حضور! ابو سفیان کو میں نے اپنی پناہ میں لے لیا ہے، حضور حکم دیتے ہیں اچھا ابو سفیان کو صبح کے وقت پیش کرنا، ابو سفیان کو گرفتار کر لیا جاتا ہے صبح ہوتی ہے اور ابو سفیان کو سرورِ عالم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے

ابو سفیان دشمنِ اسلام ہے، دشمنِ رسول ہے، ابو جہل کے بعد تمام لڑائیوں میں قریش کا قائد بن کر مسلمانوں کے مقابلہ میں آیا ہے اور مسلمانوں کا خون بہایا ہے، جاں نثار ساتھیوں کی آنکھوں میں اِس دشمنِ خدا کو دیکھ کر خون اتر رہا ہے، ہر مجاہد جوش میں بھرا ہوا ہے۔ مگر رحمتِ عالم کو اِس دشمن پر نہ غصہ آتا ہے نہ اِس کی زیادتیوں کو یاد کر کے رحمتِ عالم کو طیش آتا ہے بلکہ آپ اُسے معاف فرما دیتے ہیں نہ ساتھیوں کے غیظ و غضب کی پرواہ کرتے ہیں نہ حضرت عمرؓ کے غصہ کی، ابو سفیان اِس بے پناہ رحم و کرم کو دیکھ کر اِسلام قبول کر لیتے ہیں۔ حضرتِ عباس فرماتے ہیں، سرکار! ابو سفیان قوم کا سردار ہے اُسے کوئی اعزاز عطا فرما دیجیے، رحمتِ عالم کا کرم جوش پر ہے، اِرشاد فرماتے ہیں۔

آج کے دن جو ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اُسے امن ملے گا، جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے گا امن میں رہے گا اور جو شخص حرم میں داخل ہو جائے گا اُسے بھی امن ملے گا۔

پھر دس ہزار قدسیوں کا یہ لشکرِ عظیم رنگ برنگ کے پرچم اڑاتا ہوا مکہ کی طرف بڑھا، ابو سفیان ایک پہاڑی پر کھڑے کر دیئے گئے تاکہ لشکرِ

اِسلام کا نظارہ کر سکیں اور ان کے دل میں اِسلام کی عظمت بیٹھ جائے، لشکر میں سب سے پہلے بنی غفار کا پرچم آیا پھر دوسرے قبائل کے جوان ہتھیاروں سے لیس نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتے ہوئے گذرے، سب سے آخر میں انصار آئے۔۔۔

ابو سفیان کی آنکھیں انصار کے لشکر کے جاہ و جلال سے خیرہ ہو گئیں۔ حضرتِ عباس سے پوچھا۔ عباس۔! یہ کن لوگوں کا لشکر ہے۔ حضرتِ عباس نے نام بتایا۔ دفعتاً اِس دستہ کے سردار حضرتِ سعد بن عبادہ رضؓ ہاتھ میں علم اُٹھائے برابر سے گذرے اور ابو سفیان کو دیکھ کر اُنھیں جوش آگیا اور پکار اُٹھے ـــــ الیوم یوم الملحمۃ یعنی آج گھمسان کا دن ہے

سب سے آخر میں سرورِ کونین کا کوکبۂ حشمت جلوہ گر ہوا ابو سفیان کی نظر سرکار کے جمالِ مبارک پر پڑی، فوراً ابو سفیان پکار اُٹھے۔ حضور۔! کچھ سنا آپ نے۔؟ سعد کیا کہتے ہوئے گذر رہے ہیں، رحمتِ عالم نے فرمایا۔۔ سعد نے غلط کہا ـــــ الیوم یوم المرحمۃ۔ آج کا دن رحمت کا دن ہے پھر یہ حکم دیا کہ سعد سے علم لے کر اُن کے صاحبزادے قیس کو دیدیا جائے۔

اِس کے بعد رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوتے ہیں، کعبہ کو بتوں سے پاک کرتے ہیں، اس میں نمازِ شکرانہ ادا کرتے ہیں، پھر آپ خطبۂ فتح ارشاد فرماتے ہیں، خدا کی وحدانیت اور مساوات و اخوت کا اعلان کرتے ہیں

یا معشر قریش ان اللہ قد اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیۃ و تعظیمھا بالاٰباء والناس	اے قوم قریش۔! اب جاہلیت کا غرور اور حسب و نسب کا فخر خدا نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں

من آدم و آدم من تراب — اور آدم مٹی سے بنے ہوئے ہیں

خطبہ کے بعد آپ نے مجمع پر نظر ڈالی، دیکھا تو سامنے قریش کے بڑے بڑے جابر کھڑے ہیں، یہ وہ ہیں جو اسلام کو مٹانے میں آگے آگے رہتے تھے۔ جنکی زبانوں سے رسول برحق پر گالیوں کی بوچھاڑ رہا کرتی تھی، جو رحمت عالم پر پتھر برسایا کرتے تھے، جنھوں نے محبوب خدا کو گھر سے بے گھر کر دیا تھا، پھر یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے مدینہ کے اندر بھی خدا کے رسول کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا تھا، آج ان کو جس قدر بھی عبرتناک سزا دی جائے کم ہے، ان میں ایک بھی معاف کرنے کے قابل نہیں ہے مگر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی طرف دیکھا اور نہایت باوقار لہجہ میں پوچھا، تم کو کچھ معلوم ہے۔؟ میں آج تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں۔؟

یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے لیکن سرورِ عالم کے مزاج اور آپ کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے، رحمتِ عالم کا یہ خطاب سن کر بولے

اَخٌ کَرِیمٌ وابن اَخٍ کریم — تم شریف بھائی ہو اور شریف بھتیجے ہو

بس رحمتِ عالم کی رحمت جوش میں آگئی اور ارشاد فرمایا

لَا تثریبَ عَلَیکمُ الیوم — آج تم پر کوئی الزام نہیں، جاؤ

اذھبوا انتم الطلقاء — تم سب آزاد ہو۔

حاتم طائی کی بیٹی اور بیٹے پر رحم و کرم

در مصاف پیش آں گردوں سریر — دختر سردار طے آمد اسیر

پائے در زنجیر و ہم بے پردہ بود ۔۔۔ گردن از شرم و حیا خم کردہ بود
دخترک را چوں نبی بے پردہ دید ۔۔۔ چادرِ خود پیش روئے او کشید
ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم ۔۔۔ پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم
(اقبالؒ)

ہجرت کے نویں سال سرورِ کونین نے حضرت علی کرم اللہ تعالےٰ وجہہ کی قیادت میں ایک لشکر قبیلہ طے کی طرف بھیجا، اِس قبیلہ کے سردار حاتم طائیؒ کے بیٹے عدی تھے، عدی کو جب لشکرِ اسلام کی خبر ملی تو یہ اپنے بال بچوں کو لے کر شام کی طرف بھاگ گئے اور گھبراہٹ میں اپنی بہن کو وہیں چھوڑ گئے

حضرت علی کرم اللہ وجہہ جب قبیلہ طے کی مہم سر کر کے واپس آئے تو تو حاتم طائی کی بیٹی کو اپنے ساتھ لے آئے کیونکہ وہ اپنے سرپرست بھائی سے محروم ہو گئی تھی۔

صحابۂ کرام کا لشکر مدینہ میں داخل ہوا، حاتم طائی کی صاحبزادی حضور رحمتِ عالم کے سامنے پیش ہوئیں، اِن کے سر پر چادر نہ تھی، خوف وہراس اِن پر طاری تھا، رحمتِ عالم کی نگاہ پڑی، ایک معزز خاتون کو بے چادر دیکھ کر غیرتِ محمدیؐ جوش میں آگئی، اپنی چادر اتاری اور آگے بڑھ کر ان کے چہرہ پر ڈالدی، بڑی عزت سے انھیں پاس بٹھایا، وہ سمجھ رہی تھیں کہ میں ایک فاتح شہنشاہ کے سامنے پیش ہو رہی ہوں، میرے ساتھ قیدیوں کا سا برتاؤ ہوگا، لیکن رحمتِ عالم کا عفو و کرم دیکھ کر اُن کے دِل سے خوف دُور ہو گیا، عرض کیا ـــــ اے رسولِ برحق ـــــ! میں بڑے باپ کی بیٹی ہوں۔ ہمارا محافظ

ہمیں چھوڑ کر چلا گیا، میں ضعیفہ ہوں، کسی خدمت کے قابل نہیں ہوں، مجھ پر احسان کیجئے، خدا آپ پر احسان کرے گا۔"

بس کیا تھا، جو بغیر درخواست کے دشمنوں پر رحم کرنے کا عادی تھا اس نے ایک ضعیفہ کی درد بھری فریاد سنی اور ــــــ فوراً حکم دیا "میری سواری کا اونٹ لاؤ"ــــ اونٹ لایا گیا اور حضور نے بصد عزّ و احترام ان کے بھائی عدی کے پاس اُن کی بہن کو مُلک شام روانہ کر دیا۔

بچھڑی ہوئی بہن بھائی سے ملی، بھائی کو اپنی غم بھری داستان سُنائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ــــ بھائی ــــ! محمد نے مجھ پر بڑا احسان فرمایا، وہ تو لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو تمہارا باپ حاتم کیا کرتا تھا، میں تم سے بھی یہی کہتی ہوں کہ تم بھی اُن کے پاس جاؤ۔"

عدی یہ سنتے ہی شام سے روانہ ہو گئے، مدینہ طیبہ میں حاضر ہوئے خود فرماتے ہیں، حضور نے محبت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا، حضور میرے آنے سے پہلے لوگوں سے فرما چکے تھے خدا تعالیٰ بہت جلد عدی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے گا۔ حضور میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے کہ اتنی دیر میں ایک عورت ایک بچے کے ساتھ آئی اور اس نے حضور سے کسی کام کے لئے کہا، حضور فوراً اُس کے ساتھ تشریف لے گئے اور اُس کا کام انجام دے کر تھوڑی دیر میں واپس آئے اور آتے ہی میرا ہاتھ پکڑ لیا، عجیب محبت بھرا انداز تھا سرکار دو عالم کا! آپ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے مکان پر تشریف لائے، ایک خاتون نے گدا نکال کر حضور کے لئے ڈالا، آپ اس پر تشریف فرما ہوئے، میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا

حضور نے ارشاد فرمایا۔ عدی۔! کیا تم اللہ کو ایک ماننے سے بھاگتے تھے۔؟ کیا خدا کے سوا کوئی دوسرا معبود ہے۔؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کوئی نہیں، پھر فرمایا — عدی۔! کیا تم (اللہ اکبر) اللہ کو سب سے بڑا کہنے سے بھاگے، کیا اللہ کے سوا کوئی بڑا ہے۔؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ — ! کوئی نہیں، پھر میں نے کہا۔ حضور۔! میں نے دین حنیف قبول کرلیا، میں مسلمان ہوں، یہ سُنکر حضور کا چہرہ خوشی سے روشن ہوگیا۔

منافقین کے ساتھ سرکار نے عفو و کرم کا جو برتاؤ کیا، قرآن کریم، اس کی بہت سی مثالیں بیان کرتا ہے — یہ لوگ اپنی مجلسوں میں حضور کی بدگوئی کرتے تھے، جب اِن میں سے کوئی سمجھدار آدمی یہ کہتا تھا کہ تم لوگ رسول اللہ کی بدگوئی کرتے ہو، اگر انھیں معلوم ہوگیا تو تم کیا جواب دوگے تو یہ لوگ جواب دیتے، رسول اللہ تو کانوں کے کچے ہیں، اگر آپ کو پتہ چل گیا تو ہم انکار کردیں گے، اور آپ ہمارا یقین کرلیں گے۔

یقولون ھو اذن قل اذن خیر لکم (توبہ)

منافقین کہتے ہیں، رسول اللہ تو محض کان ہیں آپ فرما دیجئے۔ وہ تمہارے بھلے کے لیے کان ہیں۔

بات یہ تھی کہ حضور اکرم کی طبیعت میں بے حد شرافت تھی اور مروت بھی آپ اپنی بامروت طبیعت اور کریم النفسی کی وجہ سے منافقین سے درگذر فرماتے رہے حالانکہ آپ کو یقین ہوتا کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں، منافقین حضور کی پروقار

اور حیادار طبیعت کو یہ سمجھتے کہ آپ کانوں کے کچے ہیں، ہم آپ سے جو کچھ کہیں گے آپ اُس کا یقین کر لیں گے، قرآن کریم نے کہا۔ اگر ہمارا رسول باوقار اور بامروت نہ ہوتا تو تمہارے قصوروں سے درگزر نہ کرتا اور تم اپنی بدگوئی کی ہاتھوں ہاتھ سزا پاتے۔

ابن ابی منافقوں کا رئیس تھا۔ جب یہ مرا تو اس کے بیٹے نے درخواست کی۔ حضور۔! میرے باپ کی وصیت یہ تھی کہ میرے جنازے کی نماز رسول اللہ پڑھائیں، عبداللہ ــــ مخلص مسلمان تھے ان کی دل جوئی کے لئے آپ کھڑے ہو گئے، صحابۂ کرام میں سے حضرت عمر نے روکنے کی کوشش کی مگر رحمت عالم نے عمر سے دامن چھڑایا اور مصلے پر کھڑے ہو گئے، حضرت جبریل آئے اور انھوں نے رسول اکرم کو نماز پڑھانے سے روکا۔ حضور کی اس مہربانی اور شریفانہ طبیعت کو دیکھ کر بہت سے منافقین ــــ سچے دل سے مسلمان ہو گئے۔

مکہ کا قحط

مکہ میں قحط پڑا، دشمنانِ اسلام بھوکے مرنے لگے، لوگ اس درجہ پریشان ہوئے کہ مویشیوں کا گوبر اور لید دھو دھو کر اُس میں سے دانے نکالتے اور کھا لیتے اس پریشانی میں دشمنوں کو ایک دروازہ نظر آیا اور وہ دروازہ تھا رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جھٹلانے والے حضور کی نبوت کی تکذیب کرتے تھے، مگر وہ تکذیب محض زبانی تھی، ان کی زبانیں بات بات کی تہہ میں انکار کرتی تھیں مگر ان کے دلوں میں حضور کی سچائی کا اقرار موجود تھا، انھیں یقین تھا، اگر محمد ہمارے لئے اپنے خدا سے دعا کریں گے

تو ہمیں اس ہلاکت سے نجات مل جائے گی، چنانچہ سردار قوم ابو سفیان حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گذارش کی۔ محمد! تم کہتے ہو میں رحمت ہوں اگر تم رحمت ہو تو اپنی قوم کے لئے دعا کرو، قوم قحط سالی سے ہلاک ہو رہی ہے میں تم کو رشتہ داری کا واسطہ دے کر درخواست کرتا ہوں کہ تم اپنے خدا سے دعا کرو۔ اگر یہ قحط دور ہو گیا تو ہم تمہاری سچائی کا اقرار کرلیں گے۔

رحمت عالم کا دریائے کرم جوش میں آگیا دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے، دعا فرمائی، حضرت حق نے مکہ والوں کو قحط سے نجات دی، ادھر ثمامہ بن اثال نے یمامہ سے غلہ روانہ کر دیا مگر رحمتِ عالم کے اس کرم کو دیکھ کر بھی وہ سنگ دل ایمان نہ لائے اور ثابت کر دیا کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر بھی لبیک کہنے کو تیار نہیں ہیں

یہ واقعہ سورہ دخان کے پہلے رکوع میں بیان کیا گیا ہے

رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی کا ایک واقعہ اور بھی قرآن کریم نے نقل کیا ہے، ایک غزوہ میں ایک انصاری اور ایک مہاجر کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا، انصاری نے انصاریوں کو ــــ اور مہاجر نے مہاجرین کو پکارا دونوں نے آستینیں چڑھالیں، ابن ابی نے آگ پر تیل ڈالنے کا کام انجام دیا انصاریوں سے بولا "نہ تم ان لوگوں کو مدینہ میں پناہ دیتے نہ آج یہ تمہارے مقابلے میں آتے، اب بھی اگر تم رسول اللہ کی امداد بند کر دو تو یہ لوگ مدینہ سے بھاگ جائیں، ــــ پھر تکبر سے کہنے لگا اس سفر سے واپس ہو کر عزت والوں کو چاہئے کہ ان ذلیل لوگوں کو مدینہ سے باہر نکال دیں مطلب یہ تھا کہ انصاریوں کو چاہئے کہ محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کو مدینہ سے نکال دیں۔

اِس جھگڑے میں بات بہت بڑھ جاتی مگر حضور کے تدبر کی وجہ سے معاملہ رفع دفع ہوگیا یعنی جب اِس جھگڑے کی خبر آپ کو پہنچی تو آپ نے فوراً قافلہ کو کوچ کرنے کا حکم دے دیا اور لوگ جھگڑے کو بھول کر روانگی میں لگ گئے۔

ابن ابی کے لڑکے عبداللہ بڑے سچے مسلمان تھے، حضور نے انھیں بلا کر ان کے باپ کی ساری شرارت سُنائی، عبداللہ اپنے باپ سے بہت محبت کرتے تھے، باپ ان پر فخر کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ کیا پورے خاندان (قبیلۂ خزرج) میں کوئی بیٹا ایسا ہے جیسا میرا بیٹا عبداللہ، اس محبت کے باوجود جب عبداللہ نے اپنے محبوب باپ کی اپنے رسول کے ساتھ دشمنی کا حال سُنا تو وہ بولے "حضور! اگر حکم ہو تو میں اپنے باپ کا سر کاٹ لاؤں؟" آپ نے فرمایا "نہیں"۔ معاملہ ختم ہوگیا۔

یہ قافلہ جب مدینہ واپس آیا تو عبداللہ تلوار سوت کر مدینہ طیبہ کے دروازے پر کھڑے ہوگئے اور اعلان کر دیا کہ میرا باپ ابن ابی مدینہ میں داخل نہیں ہوسکتا میں آج دنیا کو دکھانا چاہتا ہوں کہ ذلیل ابن اُبیّ ہے، محمدؐ اور ان کے ساتھی صاحبِ عزّت ہیں۔

انصار و مہاجرین ایک ایک کر کے مدینہ میں داخل ہو رہے تھے اور عبداللہ تلوار سُوتے کھڑے تھے۔

ایسے موقعہ پر سرورِ عالم ابن اُبی اور دوسرے منافقین کے خلاف جتنا سخت قدم اُٹھاتے آپ کے لئے روا تھا مگر یہاں بھی رحم و کرم آڑے آگیا اور حضور نے فرمایا۔ "عبداللہ بن ابی سے کہو کہ اپنے باپ کو مدینہ میں داخل ہونے دے"۔

حضرت عبداللہ نے حضور کے حکم کو سُنا اور تلوار رکھدی اور کہا۔ اگر حضور کا حکم ہے تو اب میرا باپ داخل ہو سکتا ہے۔

یہ واقعہ اسی تفصیل کے ساتھ تفسیر ابن جریر جلد ۲۸ صفحہ ۶۶ تا ۷۰ میں مذکور ہے۔

سُراقہ کی معافی

ہجرت کے موقعہ پر جب سرور عالم مخالفین کے نرغہ میں سے بچ کر نکل آئے تو قریش نے اعلان کیا کہ جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گرفتار کر کے لائے گا اُسے سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے، یہ اعلان سُراقہ بن جعشم نے سنا اور وہ انعام کے لالچ میں ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر گھر سے نکل کھڑا ہوا، انعام کی طمع میں اندھا ہو کر سرپٹ گھوڑا دوڑا رہا تھا کہ حضور جاتے ہوئے نظر پڑ گئے، گھوڑا دوڑا کر یہ حضور کے قریب آیا لیکن قدرت نے اسے سرزنش کی اور اس کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر پڑا،

عرب بات بات پر فال نکالنے کے عادی تھے، سراقہ نے بھی فال کے تیر نکالے کہ حملہ کرنا چاہیے یا نہیں ۔۔؟ جواب میں "نہیں" نکلا، لیکن اونٹوں کے لالچ میں اس نے فال کی بھی پرواہ نہ کی اور حضور کے پیچھے پھر گھوڑا دوڑایا، اب کے دفعہ یہ ہوا کہ جب یہ حضور کی اونٹنی کے قریب آیا تو اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے، یہ فوراً گھوڑے سے اتر پڑا اور آواز دے کر حضور سے معافی مانگی اور اس بات کا وعدہ کیا کہ اگر میں اس عذاب سے بچ گیا۔ تو واپس ہو کر دشمنوں کو آپ کا پیچھا کرنے سے روکوں گا آپ نے اُسے معاف کر دیا اور اُس کے لئے دُعا فرمائی۔ جعشم نے حضور سے یہ بھی درخواست کی کہ

مجھے امن کی ایک تحریر لکھدیجیے" ، حضور نے حضرتِ ابوبکر کے غلام عامر بن فہیرہ کو حکم دیا کہ وہ چمڑے کے ٹکڑے پر فرمانِ امن لکھدیں ۔۔۔ سراقہ نے بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ (بخاری بابِ الہجرت)

جنگی قیدیوں کے ساتھ حُسنِ سُلوک

غزوہ بدر کی فتح کے بعد حضور نے قریش کے سترہ سرداروں کو جنگی قیدی بنایا، یہ قیدی مدینہ منورہ لائے گئے، اِن قیدیوں کو صحابہ کرامؓ نے جب تسموں سے باندھا اور چمڑے کے تسمے سوکھ کر سخت ہوئے تو یہ قیدی بندشوں کی سختی کی وجہ سے بے قرار ہو گئے، دو چار قیدیوں کے منھ سے تکلیف کی وجہ سے آہیں بھی نکلیں، قیدیوں کی بے قراری اور کراہنے سے رسول برحق بے قرار ہو گئے، بستر پر بے چینی سے کروٹیں لینے لگے صحابۂ کرام اپنے محبوب کی بے قراری کو دیکھ کر یہ سمجھے کہ شاید حضور اپنے محترم چچا حضرتِ عباس کی بے چینی سے بے قرار ہو رہے ہیں، یہ سوچ کر کھڑے ہوئے اور حضرتِ عباس کی بندش ڈھیلی کر دی، لیکن رحمت عالم کی بے قراری صرف چچا کی وجہ سے نہ تھی آپ نے صحابۂ کرام کو بلا کر حکم دیا ۔۔ "چچا عباس کی طرح سب قیدیوں کے بندھن ڈھیلے کر دو" ۔۔۔ آقا کے حکم کی تعمیل میں سب قیدیوں کے بندھن اور بندشیں ڈھیلی کر دی گئیں۔

حضورؐ عادِل جج کی حیثیت سے

عدل و انصاف کے الفاظ جتنے مقدس ہیں اُتنے ہی مظلوم بھی ہیں

میں نے مقدس کہا کیونکہ دُنیا کا کوئی حکمراں ایسا نہیں جو اِن الفاظ کا وظیفہ نہ پڑھتا ہو، کوئی قانون ایسا نہیں جس کی پیشانی اِن الفاظ سے مزین نہ ہو، حکومت کے ایوانوں میں جاکر دیکھئے آپ کو عدل وانصاف کے خوشنما کتبے نظر آئیں گے، سیاسی لیڈروں، اور مذہبی پیشواؤں کی تقریریں سُنئے آپ کو عدل وانصاف سے بھری ہوئی اپیلیں ملیں گی لیکن اس کے باوجود یہ الفاظ اِس قدر مظلوم ہیں کہ عمل کی دنیا میں ان لفظوں کو زندہ حقیقت بننے کا موقع بہت کم نصیب ہوتا ہے، مظلوم انسانیت کی آنکھیں عدل وانصاف کی صورت دیکھنے کو ترستی ہیں، انسانیت ہر طرف ماری ماری پھرتی ہے مگر اُسے انصاف نہیں ملتا نہ انصاف کے ٹھیکیداروں کے پاس نہ مذہب کے علمبرداروں کے پاس۔

اور اگر عدل وانصاف کے نام پر کہیں کچھ ملتا ہے تو وہ صرف انصاف کے قوانین ملتے ہیں جو عدالت کی الماریوں سے باہر نکلنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

وہ انصاف کہاں ہے جس کا اعلان خدائے برحق کی مقدس کتاب نے اِن الفاظ میں کیا ہے

لوگو۔! خدا کے لئے انصاف کرو اگرچہ انصاف تمہاری ذات کے خلاف پڑے، اس انصاف سے تمہارے ماں باپوں کو نقصان پہنچے، وہ انصاف تمہارے رشتہ داروں اور گھر والوں کے خلاف ہو۔ (سورۂ نساء رکوع ۱۹)

مطلب یہ ہے، کہ انصاف کی کوئی قیمت وصول نہ کی جائے اور خدا کے بندے کالے ہوں یا گورے اپنے مالک کے وفادار ہوں یا نافرمان، سب بلا تفریق انصاف سے فائدہ اُٹھائیں۔

یہ بے لاگ انصاف اگر کسی دور میں ملتا ہے اور کوئی دور عدل و انصاف کے لئے بہترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ دور ہے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور آپ کے اُن جانشینوں کا جنہوں نے عادلانہ فرمانروائی کا بہترین ریکارڈ قائم کیا، آج جمہوری نظام حکومت کو بہترین نظام سمجھا جاتا ہے لیکن اِس دور میں عدل و انصاف سیاسی ضرورت کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عدل و انصاف کو سیاسی مصلحت سے بلند کر کے اُسے خدا پرستی اور تقویٰ کی روح قرار دیا۔ ارشاد فرمایا ہے

عدل کرو، یہ عدل پرہیزگاری سے بہت قریب ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ایک اچھا حکمران بننے کے لئے ہی عدل کی ضرورت نہیں بلکہ خدا پرست بننے کے لئے بھی عدل کی صفت ایک ضروری صفت ہے۔

حکومتوں کے حکمراں ہوں یا قوموں کے رہنما یا خاندانوں اور بستیوں کے سربراہ اُن میں سے کوئی بھی خدا پرست کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا جبتک کہ وہ ہر معاملہ میں عدل و انصاف کا راستہ اختیار نہ کرے۔

ایسا انصاف کہنے میں تو بہت آسان ہے مگر عمل میں بہت مشکل ہے لیکن اِس مشکل کو اگر کسی نے آسان کر دکھایا تو وہ رحمت عالم اور آپ کے جانشین ہیں۔

یہودیوں کے ساتھ اِنصاف

عرب کے جاہل ماحول میں یہودی علم اور کتاب والے کہلاتے ہیں لیکن ان کی اخلاقی گراوٹ کا یہ حال ہے کہ ان کے صوفی، عالم، حاکم اور جج سب رشوت اور خیانت میں گرفتار ہیں، عوام رشوت کی اِس

گرم بازاری سے تنگ ہیں، دولتمند بڑے سے بڑا جرم کر کے بھی دولت کے
زور پر آزاد پھرتے ہیں قانون کا زور اگر چلتا ہے تو غریب لوگوں پر، یہود کے
مذہبی پیشواؤں نے تورات کے قانوں میں امیر و غریب کی تفریق قائم کر رکھی ہے
غریب زنا کرلے تو سنگسار ہو جائے، دولتمند چاہے جسکی عزت پہ ہاتھ ڈالدے
اس کا بال بیکا نہو۔

ظلم کی اس صورت حال نے یہودی عوام کو پریشان حال کر رکھا ہے اور
مذہبی مخالفت کے باوجود یہ یہود رسول پاک کے انصاف پر بھروسہ کرتے ہیں اور
جب کوئی جھگڑا ہو جاتا ہے تو ہر مظلوم دادرسی کے لیئے مدینے کے اسی عادل جج
کی طرف دوڑتا ہے، یہ جج عدالت کی بارعب بلند عمارتوں میں بیٹھکر نہیں بلکہ
کھجور کے پتوں سے پٹی ہوئی ایک چھوٹی سی مسجد میں بے لاگ انصاف کے فیصلے
کرتا ہے، دوست دشمن سب اسی کی بارگاہِ عدالت کی طرف دوڑتے ہیں۔

اِنصاف کی مِثال

ایک دن ایک یہودی اور ایک منافق کے
درمیان کسی معاملہ میں جھگڑا ہوا، یہودی اس
جھگڑے میں حق پر تھا اور منافق ناحق پر، یہودی کو یقین تھا کہ رسول پاک انصاف
کریں گے اس لیئے اس نے کہا۔ "چلو محمد کے پاس فیصلہ کرائیں گے، منافق نے
حضور کے پاس چلنے سے انکار کیا اور کہنے لگا، کعب بن اشرف کے پاس چلو،
اُس سے فیصلہ کرائیں گے، کعب ایک یہودی سردار تھا اور رشوت کھانے میں
بڑا بدنام تھا، منافق سوچتا تھا، میں ناحق پر ہوں، کعب کی جیب میں کچھ ڈال کر
اپنے حق میں فیصلہ کرالوں گا۔ باہمی ردّوکد کے بعد بالآخر یہودی کی بات چل گئی

اور دونوں فریق رسولِ برحق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضور نے دونوں کے بیانات سنے، ثبوت دیکھے اور یہودی کو حق پر قرار دے کر اس کے حق میں فیصلہ کر دیا۔

دربارِ رسالت سے باہر آکر منافق کے دل کا چور کھلا اور وہ بولا۔ میں تو حضرتِ عمر سے اس جھگڑے کا دوبارہ فیصلہ کراؤں گا، اس وجہ سے کہ شاید عمر میری ظاہری مسلمانی کو دیکھ کر میری رعایت کریں اور یہودی کو دشمنِ دین سمجھکر اس کو مجرم قرار دیں۔

یہودی مجبور ہوکر منافق کے ساتھ حضرت عمر کے پاس آیا، منافق حضرتِ عمر سے کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ یہودی نے سارا واقعہ حضرتِ عمر کو سُنایا۔

حضرت عمر نے جو یہ سُنا کہ اِس جھگڑے میں رسول پاک یہودی کے حق میں فیصلہ کر چکے ہیں اور یہ منافق اُس فیصلے سے مطمئن نہیں اس لئے میرے پاس آیا ہے تو حضرت عمر کا ایمانی جلال جوش میں آگیا، سیدھے مکان میں تشریف لے گئے، تلوار نکال کر لائے اور اس منافق کا سر قلم کر دیا۔

یہودی دوڑا ہوا حضور کی خدمت میں آیا اور سارا واقعہ حضور کو سنایا حضور نے فرمایا۔

ماکنت اظن ان یجتری	میں نہیں خیال کرتا تھا کہ عمر ایک
عمر علی قتل مومن	مسلمان کو اس جرأت سے قتل کرے گا۔

اِس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

فلا و ربک لا یومنون حتی	قسم ہے تیرے رب کی۔ یہ لوگ ایماندار نہیں

يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في انفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما ط

(سورہ نساء رکوع ۸)

جب تک کہ آپس کے اختلافات میں تجھکو اپنا حاکم نہ مان لیں، پھر تو جو فیصلہ اُن میں کردے اس سے اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی اور ناخوشی نہ پائیں اور فرمانبرداری کے ساتھ قبول کرلیں

اس آیت نے حضرت عمرؓ کو قتل مومن کے الزام سے بری کردیا، لیکن چونکہ اس طرح کے قتل کو اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لئے پسند نہیں فرمایا، اس لئے اگلی آیات نازل کر کے اس کی تاکید کردی۔[1]

اس واقعہ نے بتایا کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہودی جیسے دشمنِ اسلام کے ساتھ بھی ایک مسلمان کے مقابلہ میں بے لاگ انصاف فرمایا کرتے تھے۔

حضور کی انصاف پسندی کا ایک عجیب واقعہ امام مسلمؒ نے (فتح الملہم جلد ۱ صـ ۴۶۷) نقل کیا ہے۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ حضور کے خاص خادم تھے، یہ بیان فرماتے ہیں میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا تھا، ایک یہودی عالم حضور کے

---

[1] اس واقعہ کو حافظ ابن کثیر نے ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ کے حوالے سے نقل کرکے اثر غریب مرسل کہا ہے اور ابن لہیعہ راوی کی تضعیف کی ہے، لیکن چونکہ اس کے بعد اسی واقعہ کو معمولی تغیر کے ساتھ ایک دوسری جگہ دوسری سند سے (بحوالہ ابو اسحاق فی تفسیرہ) بیان کیا ہے جس سے اس سند کی تائید ہوجاتی ہے اس لئے اس واقعہ کو ذکر کردیا گیا۔ (جلد اول صـ ۵۲۱)

پاس آیا اور بولا ـــــ السلام علیک یا محمد۔ اے محمد سلام قبول کیجئے
میں نے اس عالم کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ گرتے گرتے رہ گیا۔
وہ مجھ سے بولا۔ تم نے مجھے کیوں دھکا دیا۔ میں نے کہا۔

الا تقول یا رسول اللہ — تم نے یا رسول اللہ کہہ کر سلام کیوں نہیں کیا۔

فقال الیہودی انما ندعوہ — اس نے جواب دیا۔ ہم آپ کو اس نام سے

باسمہ الذی سماہ بہ اھلہ — پکارتے ہیں جو اُن کے گھر والوں نے اُن کا رکھا ہے

رحمتِ عالم نے یہ گفتگو سُنکر فوراً مداخلت کی اور یہودی عالم کی تائید کرتے
ہوئے فرمایا۔

ان اسمی محمد سمانی بہ — یہ عالم ٹھیک تو کہتے ہیں، بے شک میرے

اھلی — گھر والوں نے میرا نام "محمد" ہی تو رکھا ہے۔

یہودی عام طور پر حضور کو توہین کے القاب سے آپ کو پکارتے تھے،
اس لئے حضرت ثوبان نے یہ محسوس کیا کہ اس یہودی نے حضور کا نام لے کر
حضور کی توہین کی ہے، اسی خیال سے انھوں نے اس عالم کو دھکا دیدیا،
لیکن حضور نے ثوبان کے اس رویہ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور اشارۃً یہ
بتا دیا کہ جو شخص میری رسالت کو تسلیم نہ کرتا ہو وہ اس بات کا مکلف نہیں کہ
مسلمانوں کی طرح میری تعظیم کرے۔

قریش کا طریقہ یہ تھا کہ وہ جرم کی سزا میں کم حیثیت کے لوگوں کو تو سزا
دیدیا کرتے تھے مگر شرفاء قوم کو چھوڑ دیا کرتے تھے، آج کی مہذب قوموں میں یہ فرق

فرق موجود ہے، شاہی خاندان کے آدمیوں پر سزا کا وہ قانون لاگو نہیں ہوتا جو عام رعایا پر لاگو ہوتا ہے لیکن سرورِ عالم نے انصاف اور عدل کے قانون میں کسی قسم کی رعایت روا نہیں رکھی۔

بنی مخزوم قریش کا ایک معزز خاندان تھا، جب اس قبیلہ کی ایک عورت فاطمہ بنت اسد چوری کے جرم میں گرفتار ہو کر آئی اور قریش نے دیکھا کہ رسولِ برحق عام لوگوں کی طرح اس مجرم عورت کا ہاتھ کٹوا دیں گے تو انھوں نے سفارش کے لئے حضرت اُسامہ رضؓ کو خدمتِ اقدس میں بھیجا، حضرت اُسامہ حضور کے لاڈلے تھے، حضور نے ان کی سفارش سنی اور پرجوش لہجے میں فرمایا: "یہ معاملہ تو فاطمہ مخزومی کا ہے اگر اس کی جگہ فاطمہ محمدؐ کی بیٹی ہوتی اور وہ چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کٹوا دیتا" حدیث کے الفاظ یہ ہیں ——— وَالذی نفسی بیدہٖ لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا۔

بدر کے قیدیوں میں قریش کے سرداروں کے ساتھ حضور کے داماد ابوالعاص بھی گرفتار ہو کر آتے ہیں، عام قیدیوں کی طرح انھیں بھی بند کر دیا جاتا ہے، ان کے پاس فدیہ ادا کرنے کے لئے مال نہیں ہوتا تو حکم ہوتا ہے کہ گھر سے منگا کر دو ورنہ قید رہو، ابوالعاص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی جناب زینب کو خبر بھیجتے ہیں، حضرتِ زینب اپنے شوہر کے فدیہ میں ایک قیمتی ہار بھیجتی ہیں، یہ وہ ہار ہے جو حضرتِ خدیجۃ کبریٰ نے اپنی صاحبزادی کو جہیز میں دیا تھا، یہ ہار حضور کے سامنے آتا ہے ہار کو دیکھ کر حضور کے

دل میں اپنی رفیقۂ حیات کی یاد تازہ ہوجاتی ہے اور بے اختیار آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں، حضرت خدیجہ نہ صرف حضور کی وفادار بیوی تھیں بلکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی محسن بھی تھیں، آپ کا دل چاہتا ہے کہ بیٹی کا یہ ہار جو خدیجہ کی یادگار ہے واپس کردیا جائے، مگر انصاف سے مجبور ہیں جو برتاؤ اوروں کے ساتھ ہو رہا ہے انصاف چاہتا ہے وہی برتاؤ داماد کے ساتھ بھی ہو مگر ایک صورت یہ تھی کہ عام مسلمان اس کی اجازت دیدیتے، اس لیے آپ نے مسلمانوں سے پوچھا اگر تم اجازت دو تو میں بیٹی کو اس کی ماں کی یادگار واپس کردوں، صحابۂ کرام اپنے آقا کی خواہش کو دیکھتے اور اجازت نہ دیتے؟ فوراً اجازت دیدیتے ہیں اور ابوالعاص کو رہائی نصیب ہوجاتی ہے[1]

اب ایک واقعہ خود سرورِ کونین کا سنیئے، جس میں حضور نے ایک معمولی سی بات پر اپنے آپ کو بدلے کے لئے پیش کردیا۔

رسولِ برحق میدانِ بدر میں ایک مدبّر جرنیل کی طرح بنفسِ نفیس مجاہدین کی لائینیں سیدھی کر رہے ہیں، آپ کے ہاتھ میں ایک تیر ہے، حضرت سوادؓ صف سے کچھ آگے بڑھے ہوئے ہیں، حضور نے سواد کے پیٹ میں تیر کی نوک چبھا کر کہا۔ استو یا سواد ـــ سواد سیدھے ہوجاؤ۔

سواد یا تو میدان جہاد میں جانے کے لئے بے چین ہو رہے تھے یا اُنھوں نے حضور کی طرف رخ کرلیا اور عرض گذار ہوئے

---

[1] ابوداؤد شریف

حضور۔! آپ نے مجھے تکلیف پہنچادی، حالانکہ خدا تعالیٰ نے آپ کو عدل کے ساتھ بھیجا ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

اوجعتنی وقد بعثک اللّٰہ بالعدلِ

آپ مجھے اس (تکلیف) کا بدلہ دیجئے۔ —— سواد کے یہ الفاظ سنتے ہی حضور نے اپنے پیٹ کے اوپر سے کُرتا اُٹھالیا اور فرمایا۔ سواد تو اپنا بدلہ لے لے۔ حضرت سواد رضؓ کی حضور کے بطن اقدس پر جو نظر پڑی تو فوراً حضور کے لپٹ گئے اور لپٹ کر آپ کے پیٹ کو بوسہ دیا —— حضور حیرت میں رہ گئے پوچھا —— سواد۔! تم نے کیا حرکت کی —— سواد بولے۔

حضور۔! زندگی کی آخری ساعتیں ہیں، میں موت کے منہ میں کھڑا ہوں میں نے چاہا کہ آخری وقت میں آپ کے جسم اقدس کو چھونے کی سعادت حاصل کرلوں۔ حضور نے حضرت سواد کے حق میں دُعا فرمائی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے حضرتِ سواد رضؓ کے پیٹ میں سہواً تیر کی نوک چبھ گئی تھی، یہ کوئی ظلم اور حق تلفی نہ تھی مگر اس کے باوجود اُس عادل ترین جج نے بدلے کا لفظ سن کر اپنا پیٹ کھول دیا۔

پھر اس انصاف پسند جج کی حقیقت پسندی کو دیکھئے کہ یہ اپنے عدل و انصاف پر مغرور نہیں ہوتا۔ بے مثال عدل کے ساتھ فیصلے کرتا ہے اور پھر فریقین سے کیا کہتا ہے۔؟

ایک مقدمہ کا تصفیہ فرماکر رسول برحق اپنے دولت خانہ میں تشریف لائے بعد میں آپ کو آواز آئی، مدّعی و مدعیٰ علیہ دروازہ پر جھگڑا کر رہے ہیں آواز سُنکر

آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا ـــــــ لوگو! میں انسان ہوں[1] ـــ دونوں فریقوں کے بیانات اور گواہیاں سُنکر اپنے نزدیک جسے حق پر سمجھتا ہوں اُس کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں، پس ایسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کی چرب زبانی اور زورِ استدلال مجھ پر اثر کرے اور میں اُس کے حق میں فیصلہ کر دوں لیکن یاد رکھو! میرے فیصلہ سے وہ فریق اُس چیز کا واقعی مالک نہیں بن سکتا خدا کی آخری عدالت میں اُس کا مقدمہ پھر پیش ہوگا، خدا تعالیٰ علام الغیوب ہے وہ دلوں کے حال سے بھی واقف ہے اِس لئے وہ صحیح فیصلہ فرمائے گا۔

رسولِ برحق کی یہ پر اثر تقریر سُنکر دونوں فریقوں کے دل موم ہو گئے، جو ایک منٹ پہلے لڑ رہے تھے وہ زار و قطار رونے لگے اور ہر فریق اپنے مال کے بارے میں کہنے لگا حضور! "حقی لاخی" میں اپنا حق اپنے بھائی کو دیتا ہوں، مجھے نہیں چاہئے۔

کتنی باریک بات فرمائی ہے سرکار نے؟ ایک جج کی حیثیت سے ایک پیغمبر کا فیصلہ مقدمہ کی ظاہری روداد پر مبنی ہوتا ہے، دلوں کے چھپے ہوئے حالات نہ کسی انسان کے علم میں ہوتے ہیں اور نہ کوئی پیغمبر حقیقت کے مطابق فیصلہ کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اِس لئے ہر انسان کو چاہئے اپنے دل کو ٹٹولے اور خدا کی عدالت سے ڈرتا رہے، عدل و انصاف کی اس سے بہتر اور مکمل مثال

---

[1] اصل الفاظ یہ ہیں۔ انما انا بشر و انما اقضی بنحو مما اسمع الخ (سورہ نسار ابن کثیر صـ۵۵۰)

کسی رہنمائی زندگی میں مِل سکتی ہے۔ ؟

حیاتُ النَّبیِّ ـــــــ زندہ نبیِ

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیتوں میں سے ایک بڑی خصوصیت "حیات النبی" ہے یعنی آپ اِس عالم خاکی سے پردہ فرمانے کے بعد بھی "حیات" ہیں۔

اِس معاملہ میں چونکہ لوگ افراط و تفریط میں مبتلا ہیں اِس لئے ـــــ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس مسئلہ میں علمارِ حق کا مسلک واضح کر دیا جائے۔

اس کا کیا مطلب ہے کہ حضور زندہ ہیں ـــ؟ اگر یہ مطلب ہے کہ حضور کی روح پاک موجود ہے اور باقی ہے تو اِس میں آپ کی کیا خصوصیت ہے، روح تو مرنے کے بعد ہر انسان کی زندہ رہتی ہے، مومن ہو یا کافر۔ اِسلام اور کفر کا سب سے بڑا اختلاف اِسی بات میں ہے۔

کفر کہتا ہے۔ موت فنار کا نام ہے انسان مرا اور ختم ہوا، نہ جزا ہے نہ سزا اِسلام کہتا ہے۔ موت فنا نہیں ایک عالم سے دوسرے عالم میں جانے کا نام ہے، قرآن کہتا ہے

وَاِنَّ الدَّارَ الاٰخِرَۃَ لَھِیَ الحَیَوَان — بے شک زندگی تو آخری گھر کی زندگی ہے۔

اس زندگی پر جزا و سزا طاری ہوتی ہے، اگر زندگی نہ ہوتی تو اچھوں کو اچھائی کا بدلہ اور بُروں کو بُرائی کا بدلہ کیسے دیا جاتا۔ پس جب عالم برزخ میں مومن و کافر سب کی روحیں زندہ ہیں تو صرف حضور ہی کو "زندہ نبی" کیوں کہا جاتا ہے۔؟

اچھا کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ قبر شریف میں حضور کا جسمِ اقدس محفوظ ہے؟

اس وجہ سے آپ حیات النبی ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے

ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء[1]	اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے جسموں کو کھائے

اگر اس وجہ سے حضور کو زندہ نبی کہا جاتا ہے تو خود آپ کے ارشادِ گرامی سے معلوم ہوتا ہے کہ قبروں میں زندہ رہنا صرف حضور کی خصوصیت نہیں بلکہ یہ فضیلت اللہ کے بعض اور نیک بندوں کو حاصل ہوتی ہے، ارشاد فرمایا۔

اذا مات حامل القرآن اوحی اللہ تعالیٰ الی الارض ان لا تاکل لحمہ، فتقول الارض یا رب کیف اکل لحمہ و کلامک فی جوفہ[2]	جب قرآن کا حافظ یا عالم مرتا ہے تو خدا تعالیٰ زمین کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس کا گوشت نہ کھائے، زمین جواب دیتی ہے کہ خداوندا۔ میں اس حامل قرآن کا گوشت کیسے کھا سکتی ہوں جب تیرا کلام اس کے سینہ میں محفوظ ہے
(بحوالہ تفسیر مظہری)	

---

[1] بوادر النوادر ص ۵۱۹ بحوالہ ابوداؤد، ابن ماجہ، حاکم

پھر قرآنِ کریم نے شہید فی سبیل اللہ کو زندہ کہا ہے، اِس حیات معنوی کے اعتبار سے جو خدا کی راہ میں حق کے لئے مرکر شہید کو حاصل ہوتی ہے۔

اب اِس سوال کو پھر دوہرا لیجئے کہ حضور کو کس خصوصیت کے لحاظ سے حیات النبی کہا جاتا ہے —؟ اِس تمہید کے بعد آپ حیات النبی کے حقیقی مفہوم کو آسانی سے سمجھ لیں گے۔

"تمام نبیوں اور ولیوں" میں صرف حضور کو حیات النبی (زندہ نبی) اِس لئے کہا جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عالم خاکی سے پردہ فرمانے کے بعد بھی اِس عالم کی طرف پوری طرح متوجہ ہیں، آپ خاتم النبیین ہیں، آپ کے بعد خدا کے بندوں کی ہدایت کے لئے کوئی نبی آنے والا نہ تھا اس وجہ سے ضروری تھا کہ آپ کی عظیم روحانیت اِس عالم پر متوجہ رہے تاکہ آپ کی توجہ سے ہدایت کا سلسلہ جاری رہے اور آپ کے جانشینوں (علماء حق) کے لئے تبلیغِ حق کے مشکل ترین منصب پر قائم رہنا آسان رہے۔

حضور عالم روحانیات میں اپنے رب کی تجلیات کے مشاہدہ میں مستغرق ہیں لیکن آپ کا وہ استغراق مخلوق خدا کی طرف توجہ کرنے سے آپ کو نہیں روکتا، جتنا جتنا استغراق حضور کا مشاہدۂ حق میں بڑھتا جاتا ہے اتنی ہی توجہ اُس کے بندوں کی طرف بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے، یہی ہے وہ کمال جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تنہا ہیں۔

ہماری حالت یہ ہے کہ جب ہم ایک طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں تو دوسری طرف ہماری توجہ کم ہو جاتی ہے، لیکن حضور کی عظیم روحانیت کا یہ کمال ہے

کہ آپ اپنے رب سے جس قدر قریب ہوتے ہیں اور اس کے جمال کے مشاہدہ میں جتنے زیادہ مستغرق ہوتے ہیں اُسی قدر آپ میں توجہ الی الخلق کی قوت پیدا ہوتی ہے یعنی جس قدر خالق سے قریب ہوتے ہیں اُسی قدر مخلوق سے نزدیک ہوتے ہیں۔ اس نزدیکی کو ہم نے توجہ سے تعبیر کیا ہے اور اسی توجہ کو ہم روشنی بھی کہہ سکتے ہیں۔

پس رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں کیونکہ آپ کی توجہ سے دنیا کی حیات روحانی برقرار ہے، آپ زندہ ہیں، کیونکہ آپ کے روحانی تصرف سے روحانیت اور خدا پرستی کا وقار باقی ہے۔

اوپر جو کچھ کہا گیا وہ محض ایک مسلمان کی عقیدت نہیں بلکہ ایسی حقیقت ہے، جس کے اعتراف کی ایک جھلک ہمیں مغربی مفکرین کے ہاں بھی نظر آتی ہے ڈاکٹر گستاؤلی بان اپنی مشہور کتاب "تمدنِ عرب" میں لکھتا ہے۔ ترجمہ ملاحظہ ہو۔

> اس پیغمبرِ اسلام، اِس نبی امّی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگزشت ہے جس کی آواز نے ایک ناہنجار و ناکارہ قوم کو جو اس وقت تک کسی حکمراں کے تحت نہیں آئی تھی اپنا تابع کیا اور اس درجہ پر پہنچایا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر کر ڈالا۔ اور اس وقت بھی وہی نبی اُمی اپنی قبر کے اندر لاکھوں بندگانِ خدا کو کلمۂ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہیں۔

(شہادتِ اقوام از حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ)

دوسروں کی شہادت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر

اس عنوان کے تحت آپ کے سامنے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کے بارے میں مغربی مصنفین کی شہادتیں اور ان کے اقوال پیش کئے جارہے ہیں

سر ولیم میور، ایک بڑا محقق انگریز ہے، ۱۸۶۸ء سے ۱۸۷۴ء تک ہندوستان کے مشہور صوبہ یو۔ پی کا گورنر رہ چکا ہے، اس نے چار جلدوں میں بڑی تحقیق کے ساتھ لائف آف محمدؐ Life of Mohammad کے نام سے حضورؐ کی سوانح عمری لکھی ہے، اس کتاب میں مورخ لکھتا ہے، ترجمہ ملاحظہ ہو

حضرتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاص اور سچائی کا یہ زبردست ثبوت ہے کہ سب سے پہلے اُن کا مذہب قبول کرنے والے اُن کے دلی دوست اور اُن کے گھر والے تھے، یقیناً یہ لوگ حضرتِ محمدؐ کی روزمرہ کی زندگی اور گھریلو حالات سے اچھی طرح واقف ہوں گے، ظاہر بات ہے کہ جو لوگ مکّار اور عیّار ہوتے ہیں ان کی پبلک زندگی اور گھریلو زندگی میں بڑا فرق ہوتا ہے وہ عوام کو سنانے کے لئے کچھ کہتے ہیں اور اُن کا اپنا عمل کچھ ہوتا ہے پس اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مقصد لوگوں کو دھوکہ دینا اور فریب میں مبتلا کرنا ہوتا تو ناممکن تھا کہ اس کا اُن کے قریبی دوستوں اور گھر والوں کو پتہ نہ چلتا

مسٹر گاڈفرے ہنس انگلستان کا ایک فاضل عیسائی عالم ہے، اس شخص نے

۱۸۲۹ء میں ایک کتاب اپالوجی آف محمد Apology of Mohammad لکھی تاکہ اس کتاب کے ذریعہ وہ متعصب پادریوں کے پھیلائے ہوئے الزامات کی تردید کرے اور رسول پاک کے بارے میں جاہل عیسائیوں نے جو غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں ان کا پردہ فاش ہو جائے۔ یہ فاضل مورخ اپنی کتاب کے فقرہ ۱۸ میں لکھتا ہے

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ابتدائی زندگی بہت کچھ یکساں ہے لیکن بعض باتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، مثلاً حضرت عیسیٰ پر سب سے پہلے جو بارہ حواری ایمان لائے وہ ان پڑھ، بے سمجھ اور بہت کم حیثیت کے لوگ تھے اس کے برعکس حضرت محمدؐ پر سب سے پہلے جو لوگ ایمان لائے اُن میں آپ کے غلام زید کے سوا سب اونچے طبقے کے لوگ تھے جنہوں نے خلیفہ اور سپہ سالار کی حیثیت سے بڑے بڑے شاندار کارنامے انجام دیئے اور ثابت کر دیا کہ یہ لوگ ایسے سیدھے سادھے نہ تھے کہ جو کسی کے دام فریب میں پھنس جاتے۔

بعض عیسائی علماء کہتے ہیں کہ دین عیسوی کے لئے یہ بات فخر کی ہے کہ اس پر سب سے پہلے کم حیثیت کے غریب لوگ ایمان لائے مگر کوئی مجھ سے پوچھے تو مجھے اس بات سے خوشی ہوتی اگر حضرت عیسیٰ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے لاک اور نیوٹن Newton کی حیثیت کے فلاسفر ہوتے

یہی فاضل مورخ اپنی کتاب کے فقرہ ۲۴ پر لکھتا ہے۔

تمام عیسائی مورخ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شروع سے لے کر عمر کے وسط یعنی سال چالیس برس تک محمدؐ صاحب کا چال چلن اور ان کی سیرت بہت اچھی رہی جس کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا جا سکتا۔ جب یہ حقیقت ہے تو پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ ایک شخص وسط عمر تک تو نہایت متدین اور جفاکش رہے اور اس دیانت اور جفاکشی کے صلے میں اس کو دولت اور امارت میسر ہوئی اور پھر اس کی خوش نصیبی اور آسودگی اُسے یکایک دغاباز اور مکّار بنا دے

اگر یہ کہا جائے کہ محمدؐ کی سیرت میں تبدیلی دنیا پر حکمرانی کرنے کے خواب یا نفس پرستی کے شوق کی وجہ سے ہوئی تو یہ بات بھی سمجھ سے باہر ہے کیونکہ اگر محمدؐ کو حکومت کرنے کا شوق تھا تو اس کی سب سے پہلی تدبیر یہ تھی کہ وہ کعبہ کا متولّی بننے کی کوشش کرتے، کعبہ کی تولیت اُن کے خاندان میں چلی آرہی تھی اور یہ مرتبہ تمام مُلکِ عرب میں اونچا سمجھا جاتا تھا لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کیا۔

رہی عیش پرستی کی بات تو یہ الزام بھی حضرت محمدؐ پر نہیں لگایا جا سکتا، کیونکہ سب سے پہلے اُنھوں نے اپنی شادی ایک بیوہ عورت سے کی جو عمر میں اُن سے پندرہ برس بڑی تھی اور خود اُن کی عمر اُس وقت ۲۵ برس کی تھی جو عین شباب کا زمانہ ہوتا ہے۔

پھر وہ اپنے ملکی رواج کے مطابق کئی بیویاں رکھ سکتے تھے مگر اُنھوں نے خدیجہ کے مرنے تک کوئی دوسری شادی نہیں کی اور اپنی اس بیوی کے ساتھ حد درجہ اخلاص اور محبت کے ساتھ وقت گذارا۔

خدیجہ کے انتقال کے وقت حضرتِ محمدؐ کی عمر پچاس برس سے
زیادہ تھی یعنی شباب ختم ہو چکا تھا، پس ایسا شخص جو صورت اور
سیرت دونوں میں یکتا مانا جاتا ہو اور وہ ایک چالیس سالہ بیوہ عورت
کے ساتھ اس قدر محبت اور اخلاص کے ساتھ وقت گذارے تو اس کے
بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس شخص کے جذبات
تشکر و احسان مندی نے محبت کی صورت اختیار کر لی تھی اور شکر گذاری
کی صفت "صفتِ محمود" ہے۔

مسٹر ٹامس کارلائل Thomas Carly انگلستان کا مشہور فاضل
مورخ ہے وہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ

جو پہلی بار ۱۸۴۰ء میں
چھپی ہے، کے لکچر دوم صفحہ ۴۳ پر لکھتا ہے

ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں ہرگز یہ خیال نہیں کر سکتے کہ
(جیساکہ متعصب عیسائیوں نے پھیلایا ہے) کہ حضرت محمدؐ صرف ایک
شعبدہ باز اور تہی باطن شخص تھے اور نہ ہم ان کو ایک حقیر جاہ طلب
اور منصوبے گانٹھنے والا شخص کہہ سکتے ہیں۔

جو سخت اور ٹھوس پیغام محمدؐ صاحب نے دنیا کو دیا وہ ہر حال میں
ایک سچا اور حقیقی پیغام تھا، اس پیغام کا ماخذ وہی ہستی تھی جس کی تھاہ
کسی نے بھی نہیں پائی، نہ اس شخص کے اقوال جھوٹے تھے نہ اعمال اور
نہ وہ صداقت سے خالی تھا نہ وہ کسی کی تقلید تھی بلکہ وہ حیات ابدی کا

ایک نورانی وجود تھا جو قدرت کے وسیع سینہ میں سے دنیا کو منوّر کرنے نکلا تھا

انسائیکلوپیڈیا برطانیکا کا فاضل مقالہ نگار "محمد اور اس کے مذہب" کے عنوان کے تحت لکھتا ہے۔

جو یقین حضرتِ محمد نے اپنے گھر کے آدمیوں اور قریبی دوستوں یعنی خُذیفہ، ابو بکر، اور عمر کے دِل میں پیدا کیا جو تکلیفیں اور مصیبتیں محمد صاحب نے بارہ برس تک جھیلیں، جس جوانمردی سے اُنھوں نے ہر قسم کی دولت اور حکومت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ان کی سادہ مزاجی اور سادہ طرز معاشرت جو آخر وقت تک اُن میں قائم رہی، ان سب باتوں کی بنا پر ہم پریڈو، والٹیر اور مراکشی جیسے مصنفین کی رائیں قبول نہیں کر سکتے بلکہ مہلر، کاسن، کارلائل، ارونگ اور دیگر مصنفین سے متفق ہیں کہ عام طور پر حضرتِ محمد کی صداقت کو تسلیم کریں اور اس بات کو قبول کریں کہ اُن کو اپنے اوپر بھروسہ تھا اور وہ اپنی رسالت کو برحق سمجھتے تھے۔

وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العٰلمین

اخلاق حسین قاسمی دہلوی

کتبہٗ محمود بن عبدالرشید دہلوی
صفر ۱۳۸۶ھ

رحمت عالم کانفرنس دہلی کا تبلیغی مشن
حضرت مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی دہلوی
کی اہم تبلیغی اور تاریخی کتابیں
رحمت عالم کانفرنس دہلی ہند و پاکستان کا وہ واحد ادارہ ہے جو مشنری طریقہ پر ہر ماہ ہزاروں دینی کتابیں اور تبلیغی پمفلٹ اردو، ہندی اور انگلش میں مفت تقسیم کرتا ہے۔
افلاس و غربت اور اس کے ساتھ بڑھتی ہوئی بے دینی اور فرقہ پرست عناصر کی اسلام اور ملی روایات کے خلاف مسلسل سازش کے اس دور میں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ
● غریب مسلمانوں اور غیر مسلم حضرات کے پاس دین کا بنیادی لٹریچر مفت پہنچایا جائے۔
● سیرت و تاریخ کی کتابوں کو فرقہ پرستوں کے پھیلائے ہوئے پروپیگنڈہ کے پیش نظر نئے اسلوب و جدید طرز پر مرتب کیا جائے اور تبلیغی نقطۂ نظر سے کم از کم قیمت پر ان کتابوں کو بازار میں لایا جائے۔
کانفرنس ان دونوں مقاصد کو اہل خیر مسلمانوں کے تعاون سے انجام دے رہی ہے، آپ سے توقع ہے کہ آپ کانفرنس کے ساتھ مکمل تعاون کریں گے۔
کانفرنس کا مفت تقسیم ہونے والا لٹریچر اور اس کی قیمتی کتابوں کا تعارف حسب ذیل ہے۔
رحمت عالم کانفرنس ۱۸۳۸
لال کنواں۔ دہلی

مخالفین اسلام کے پروپیگنڈہ کا مکمل جواب
اسلام کے خلاف سیاسی
لوگوں کے پھیلائے ہوئے زہر کا علاج
رحمت عالم کانفرنس دہلی کے
سیرت پمفلٹ
(۱) توحید و نماز ابتدائی تعلیم مولانا اخلاق حسین قاسمی
(۲) افضل الانبیاء حضورؐ کے ذاتی کمالات حکیم الامت حضرت تھانویؒ
(۳) گھر والوں کے ساتھ حضورؐ کی گھریلو زندگی مولانا اخلاق حسین قاسمی
(۴) قومی اتحاد اتحاد کے اسلامی اصول مولانا محمد طیب صاحب
(۵) اسلام کا نظام عدل سیاسی نظام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح
(۶) ہم اور ہمارے حکمراں مولانا احمد سعید صاحب رح
(۷) قومی ایکتا ہندی میں مولانا محمد طیب صاحب
(۸) " انگریزی میں " " "
(۹) انقلابی کارنامہ حضورؐ کی انقلابی دعوت مولانا حفظ الرحمٰن رح
(۱۰) اسلامی عقائد اردو مع ہندی مولانا اخلاق حسین قاسمی
PAY HEED TOWARDS THE FORECAST
OF THE HOLY PROPHET MOHAMMAD